محمد شفیع الدین نیّر

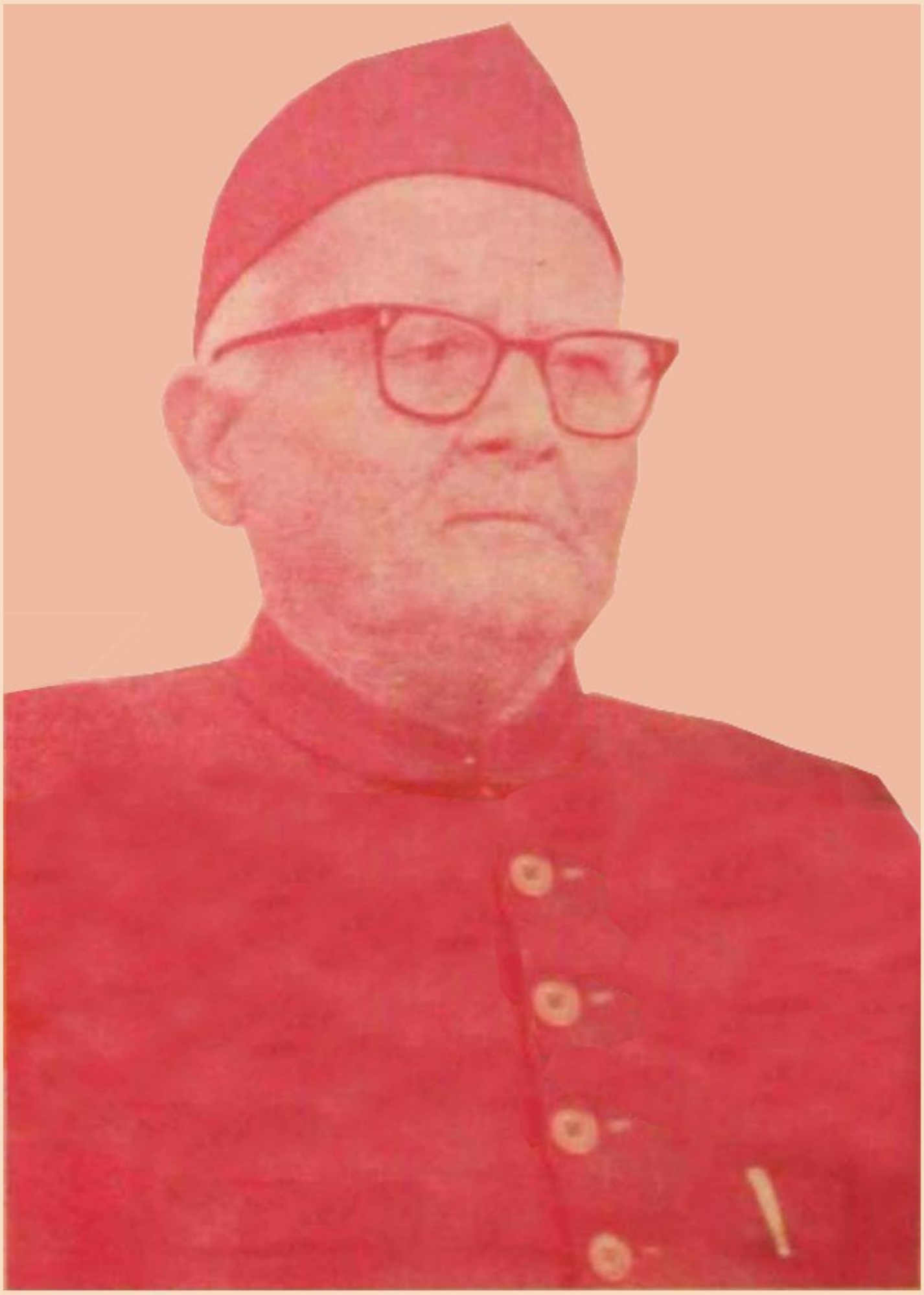

مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

© اطہر پرویز

شفیع الدین نیّر

ایک مطالعہ

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلا ایڈیشن دسمبر [illegible]ء

تعداد 1000

قیمت: 7/50

لبرٹی آرٹ پریس، پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی میں طبع ہوئی۔

www.taemeernews.com

پیش لفظ

جناب محمد شفیع الدین نیّر کا نام بچّوں کے عظیم شاعر کی حیثیت سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انھوں نے حالی، اسماعیل، اقبال اور حامد اللہ افسر کی روایات کو آگے بڑھایا۔ ہمیں خوشی ہے کہ نیّر صاحب پر یہ کتاب بچّوں کے ادیب اطہر پرویز نے لکھی۔ یہ ان کا حق بھی تھا اور فرض بھی ——— نیّر صاحب اور پرویز صاحب کے تعلقات کی عمر ۲۵ سال سے بھی زیادہ تھی۔ اس لیے پرویز صاحب کی لکھی ہوئی کتاب کی اہمیت یقیناً مسلّم ہے۔ پرویز صاحب نے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک "پیام تعلیم" کے ادارتی فرائض انجام دیے۔ اور اسی زمانے میں وہ نیّر صاحب سے بہت قریب ہوئے۔ ان کی کتاب میں جو ذاتی تعلّق ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

پرویز صاحب کو یادداشتیں لکھنے میں کمال حاصل ہے۔ یہ کتاب بھی ایک طرح کی یادداشت ہے۔ اس سے پہلے انھوں نے "علی گڑھ سے علی گڑھ تک" لکھی ——— یہ کتاب اپنے دلچسپ اندازِ تحریر کی بنا پر اردو داں حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ ان کے یہاں بات سے بات پیدا ہوتی ہے۔ ایک بات کہتے کہتے وہ بہک جاتے ہیں اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ موضوع سے ہٹ گئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے ع "آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں" وہ پھر اپنے اصل راستے پر آجاتے ہیں اور یہ بہکنا قاری کی دلچسپی کو اور بڑھا دیتا ہے ——— ان کی تحریر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں بھولتے۔ انھیں اپنے پڑھنے والوں کا ویسے ہی اعتماد

www.taemeernews.com

حاصل رہتا ہے جیسا کہ نانی اماں کو ——— جب وہ رات گئے تک بچّوں کو کہانی سناتی ہیں۔

پرویز صاحب نے متعدد اشخاص کے خاکے لکھے ہیں جو خاصے مقبول ہوئے ہیں ان میں یہی خصوصیت کارفرما ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا خاکہ ہے۔ ہم اس کی مدد سے نیّر صاحب کی شخصیت کو بڑی حد تک سمجھ سکتے ہیں بلکہ نیّر صاحب کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ جو لوگ نیّر صاحب کو ذاتی طور پر جانتے ہیں وہ اس خاکے کے توسّط سے ان کو پہچان لیں گے۔ جو لوگ ان کو نہیں جانتے یا جنھوں نے صرف ان کی نظمیں پڑھی ہیں وہ نیّر صاحب کی شخصیت سے واقف ہو جائیں گے۔

یہ کتاب نیّر صاحب کے کاموں کا اعتراف ہے۔ اطہر پرویز صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک فریضے کو بحسن و خوبی ادا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اردو پڑھنے والوں میں مقبولیت حاصل کرے گی۔

جامعہ نگر ——— نئی دہلی
یکم جنوری ۱۹۸۲ء

ولی شاہ جہانپوری
اڈیٹر "پیام تعلیم"

www.taemeernews.com

چند باتیں

یہ جنوری ۱۹۷۶ء کی بات ہے۔ نیّر صاحب سے ملاقات ہوئی بچّوں کے ادب کے بارے میں بات ہوئی کہنے لگے ——— "آپ اس موضوع پر ایک مفصّل مقالہ لکھیے" ——— میں نے کہا ——— "نیّر صاحب! میں تو پہلے آپ پر کچھ لکھوں گا۔"

نیّر صاحب یہ سن کر خاموش ہو گئے اور انھوں نے ایک بزرگ ادیب کا واقعہ سُنایا جنھوں نے ان کی کتاب پر پیش لفظ لکھنے سے احتراز کیا تھا۔ میں نے کہا ——— "نیّر صاحب آپ کیوں فکرمند ہیں ——— وہ خود ایک بڑے اعزاز سے محروم ہو گئے ——— آپ کو ادیب اور شاعر کہلانے کے لیے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اُسی وقت طے کر لیا کہ میں نیّر صاحب پر ضرور کچھ لکھوں گا۔ لیکن چند ماہ کے اندر ہی مجھے موریشس جانا پڑا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو میں موریشس میں تھا۔ اسی دوران "پیامِ تعلیم" نے ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء میں دو شمارے نیّر صاحب پر مخصوص شائع کیے ——— میں ان شماروں میں نیّر صاحب پر کچھ نہ لکھ سکا ——— بلکہ یہ پرچے بھی مجھے اُن کے انتقال کے بعد ملے۔

پھر برابر سوچتا رہا کہ ضرور کچھ نہ کچھ لکھوں گا۔ نیّر صاحب کا خیال آتا ہے تو مجھے لگتا ہے کہ جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہی ہو۔ لیکن جب سے ہندوستان واپس آیا یونی ورسٹی کی تدریسی ذمہ داریوں کے علاوہ انتظامی کاموں میں ایسا گھر گیا کہ فرصت نہ مل سکی۔ جی چاہتا تھا کہ یکسوئی حاصل ہو تو میں ان کے سلسلے

www.taemeernews.com

میں قلم اٹھاؤں ——— یکسوئی تو خیر کیا حاصل ہوتی لیکن اپنے آپ سے کیے ہوئے اس عہد کو مجھے پورا کرنا تھا — میں نے بہرحال اب چند صفحات لکھے ہیں۔ کہہ نہیں سکتا کہ میں اس چھوٹی سی کتاب میں مولوی شفیع الدین نیّر صاحب کے ساتھ انصاف کر سکا یا نہیں، لیکن مجھے یہ خوشی ضرور ہے کہ میں ایک فرض سے عہدہ برآ ہوا ہوں۔ میں نے اس کتاب کے لکھنے کے دوران نیّر صاحب کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزارا ہے۔ مجھے بار بار محسوس ہوا ہے کہ میں گزرے ہوئے لمحات کو کھینچ کر لے آیا ہوں۔ اس عمل میں، میں نے بار بار نیّر صاحب سے باتیں کی ہیں اور اسی لیے یہ کتاب میں نے بہت مختصر عرصے میں مکمل کی ہے۔ اس میں سب کچھ نیّر صاحب کی دین ہے صرف زبان اور بیان میرا ہے اور اس کی خامیوں کے سلسلے میں، میں قارئین سے معافی چاہتا ہوں۔

شاید یہ نیّر صاحب پر لکھی جانے والی بڑی بڑی کتابوں کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

میں نے اس کتاب میں "الف لیلہ" کی ایک کہانی کا مختصر سا حصّہ بھی شامل کر لیا ہے ——— یہ کہانی نیّر صاحب کو بہت پسند تھی۔ میں نے اسی لیے اس پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔ امید ہے کہ قارئین بھی اس کہانی کو پسند کریں گے۔

میں جناب شاہد علی خاں کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری اس کوشش کو پسند فرمایا اور اشاعت میں دلچسپی لی۔

اطہر پرویز
شعبۂ اردو
علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ

www.taemeernews.com

میں نے اپریل ۱۹۴۵ء میں جب ایم۔اے کا امتحان فارسی ادبیات میں دیا تو ایسا لگا کہ اب باقاعدہ تعلیم کا یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ پروفیسر ہادی حسن شعبہ فارسیہ کے سربراہ تھے۔ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں آج جیسا ریسرچ کا زور نہ تھا۔ تاہم میرے پی ایچ ڈی کے داخلے کی بات ہو رہی تھی کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد (وائس چانسلر) نے پروفیسر ہادی حسن سے کہا کہ برٹش سرکار کو ایک اسامی کی ضرورت ہے۔ شعبہ فارسیہ سے ایک ایسے طالب علم کے نام کی سفارش کی جائے جو ــــــ

- ایران میں رہ سکے۔
- فارسی میں ایم۔اے ہو۔
- فارسی زبان میں تھوڑی بہت بات چیت کر سکے۔
- مسلمان ہو، اور علی گڑھ کا فارغ التحصیل ہو۔

قرعہ میرے نام پڑا۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد مسلم یونی ورسٹی کے کرتا دھرتا تھے۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد سے میرا تعارف ڈاکٹر عباد الرحمٰن خاں نے کرایا تھا۔ وہ الہ آباد میں ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن تھے، ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کے دوست اور میرے کرم فرما تھے۔ اس لیے بھی ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد میرا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ہاں تو انھوں نے مجھے بلایا۔ کہنے لگے: "مبارک ہو۔ اتنی بڑی ملازمت کے لیے ڈاکٹر ہادی حسن نے تمھارا نام تجویز کیا ہے"۔ میں بے حد خوش ہوا کہ ہادی صاحب کو میرا اتنا خیال ہے۔ اب میرے سامنے ایک شان دار مستقبل ہوگا۔ لیکن میں ۱۹۴۲ء سے ہی ذہنی طور پر سیاست میں داخل ہو چکا تھا۔ "نشاط" میں ممتاز حسین (ممتاز ترقی

www.taemeernews.com

پسند نقّاد، وہ اب پاکستان میں ہیں)، سیّد حسن امام (اب کلکتہ کے معروف بیرسٹر ہیں) جناب معبود حسن، مونس رضا کی صحبت میں، میں نے اشتراکیت کے درس لیے تھے۔ ہم لوگ ایک ساتھ رہتے تھے۔ سچّی آزادی کا تصوّر ہمارے ذہن میں مساوات کی شکل میں تھا۔ اس زمانے میں مجاز، وامق جونپوری، ڈاکٹر کنور محمد اشرف، سیّد سجاد ظہیر، اور دوسرے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ روپے پیسے کی مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ سو سوا سو روپیا گھر سے آتا تھا جو میری ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ پھر اشتراکیوں کی صحبت نے مجھے روپے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی کوئی اہمیت اور وقعت نہ تھی۔ چنانچہ اس ملازمت سے مجھے مالی طور پر کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی لیکن یہ خیال ضرور پیدا ہوا کہ اس بہانے ہندوستان سے باہر جانے کا موقع ملے گا۔ میں نے اس ملازمت کے بارے میں مزید معلومات اکٹھا کیں تو بڑی دلچسپ بات معلوم ہوئی کہ یہ ایک طرح کی باعزّت جاسوسی کا کام ہوگا۔ مجھے تہران یونی ورسٹی میں تحقیقی کام کرنے کے سلسلے میں داخلہ مل جائے گا اور میں تحقیقی کاموں کے ساتھ ساتھ کچھ برطانوی سرکار کی مدد بھی کروں گا۔ یہ میری سیاسی تربیت کا اثر تھا کہ بہت سے لوگوں کے زور دینے پر بھی میں نے اس ملازمت کو ٹھکرا دیا۔ حالانکہ بعد میں بعض لوگوں نے مجھے یہ بتایا کہ اگر میں وہاں چلا جاتا اور کچھ دنوں کے بعد اِک دم سے یہ اعلان کرتا کہ برطانوی حکومت مجھ سے یہ کام لے رہی ہے تو اس کا ہر طرف شور مچتا اور ساری دنیا میں میرا نام مشہور ہو جاتا۔ لیکن اس وقت میری عمر ہی کیا تھی بیس سال کا ۱۹۴۵ء کا نوجوان۔ دنیا کے ان تمام ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا۔ میرے دل سے آواز آئی کہ یہ بُری بات ہے کہ میں کسی ملک کے لیے سازش میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے کپڑے جھاڑ دیے اور کھڑا ہو گیا۔ جب یہ بات ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کو معلوم ہوئی تو وہ بہت ناراض ہوئے، اور پھر پروفیسر ہادی حسن نے کہا کہ اب تمھارے لیے علی گڑھ میں ٹھہرنا

www.taemeernews.com

مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میرا داخلہ نہ ہوسکا اور مجھے یونی ورسٹی چھوڑنی پڑی۔ ذاکر صاحب سے رشید صاحب کے یہاں ملاقات ہوئی۔ انھوں نے جامعہ آنے کی دعوت دی لیکن بات جمی نہیں۔ میرا ذہن تو اونچی اڑان کر رہا تھا۔

میں نے سوچا کسی قیمت پر سرکاری ملازمت نہ کروں گا۔ لہٰذا لے دے کر اخبار نویسی ہی رہ گئی تھی۔ چنانچہ میں نے بلا تعارف عبداللہ بریلوی کو خط لکھا۔ وہ "بامبے کرانیکل" کے چیف اڈیٹر تھے اور ہندوستان کے ممتاز ترین صحافیوں میں سے تھے میں نے ان سے باقاعدہ خط و کتابت شروع کر دی۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ آجاؤ ـــــ لیکن خرچ کی ذمہ داری نہیں لیتا ـــــ ویسے مضامین لکھنے سے کچھ نہ کچھ مدد تو ہو ہی جائے گی۔ صحافی ہونے کے خیال ہی سے میں خوش ہوگیا۔ سید سجاد ظہیر صاحب کو لکھا۔ انھوں نے بھی سہارا دیا اور بمبئی آنے کی دعوت دی۔ میں بمبئی کے راستے پر چل پڑا۔ گوندیا میں میرے بھائی تھے ان سے ملنے کے لیے چند روز وہاں رکا۔ وہاں مزدور تحریک کا زور شروع ہوا تھا۔ کچھ مزدور رہنماؤں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کے ساتھ جلسوں میں جانا شروع کیا اور پھر تو میرا وہاں سے نکلنا مشکل ہوگیا۔ صحافت کا "کیریر" سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا اور دیکھتے دیکھتے میں باقاعدہ ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ ہوگیا۔ اس لیڈری میں پانچ سال گزر گئے ـــــ مزدور سیاست میرے لیے کمبل بن گئی۔ اس کی کہانی بڑی لمبی ہے۔ یہ زمانہ ہنگاموں، جلوسوں، لاٹھی چارج اور گولیوں کا تھا۔ کتنی انجمنیں بنائیں۔ یہاں تک کہ فوجیوں کی بغاوت کی تحریک میں شامل ہوگیا۔ اس کی کہانی پھر کبھی سناؤں گا۔ پھر آخر جیلوں کے راستے سے ہوتا ہوا الہ آباد پہنچا ـــــ اور وہاں سے "تاباں صاحب کے توسط سے آگیا۔

●

میں جون ۱۹۵۰ء میں جامعہ ملیہ میں وارد ہوا ـــــ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔

www.taemeernews.com

اوکھلے میں بہت پہلے آچکی تھی ——— چھوٹی سی بستی تھی۔ یہاں مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کی عمارت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ کالج کی عمارت ابھی بنی نہ تھی۔ جس مکان میں اب جناب قیصر زیدی رہتے ہیں۔ یہی جامعہ کالج کہلاتا تھا۔ نیچے پڑھائی ہوتی تھی۔ اوپر کی منزل میں ان کا 'رین بسیرا' تھا۔ ایک کوٹھی ڈاکٹر سیّد عابد حسین کی تھی۔ اس کے پاس ڈاکٹر محمود حسین خاں کی کوٹھی تھی۔ اس میں نیچے مکتبہ کے مینجنگ ڈائرکٹر حامد علی خاں رہتے تھے اور اوپر مکتبہ جامعہ کا دفتر تھا۔ اس کے پاس ہی ذاکر صاحب کی کوٹھی تھی۔ اس کے پیچھے پروفیسر محمد مجیب کی کوٹھی تھی۔ عابد صاحب کی کوٹھی سے ذرا فاصلے پر پروفیسر محمد عاقل کی کوٹھی تھی ——— اس کے مغرب کی طرف غفار منزل تھی اور اس کے قریب ہی برکت علی صاحب کی ظفر منزل تھی۔ غفار منزل میں کالج کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔ برکت صاحب جب پاکستان چلے گئے تو مجیب احمد خاں اس مکان میں رہنے لگے۔ یہی کچھ جامعہ کی کائنات تھی۔ باقی اللہ کا نام تھا۔ استادوں کے مدرسے کی عالیشان عمارت زیر تعمیر تھی۔ اسٹاف کوارٹرز بن رہے تھے۔

میں جامعہ آ تو گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ کہاں ٹھہروں۔ غلام ربانی تاباں صاحب میرے میزبان تھے۔ وہ مدرسہ ثانوی میں رہ رہے تھے۔ ڈاکٹر آغا اشرف کے مکان میں ——— جو اپنے آبائی وطن کشمیر گرمیوں کی چھٹیوں میں گئے ہوئے تھے۔ ان کو میں علی گڑھ سے جانتا تھا۔ یہ ہماری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے نائب صدر رہ چکے تھے۔

تاباں صاحب شاعر تو بڑے تھے ہی، ان کا دل بھی بڑا تھا۔ انھوں نے دعوت دے دی اور بقول اُن کے ——— چمگادڑ کی مہمان نوازی کا معاملہ تھا۔ چنانچہ میں بھی مدرسہ ثانوی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں لٹک گیا۔ گرمی کا

www.taemeernews.com

زمانہ تھا - دن اور رات مزے میں کٹ جاتے تھے - ڈاکٹر انصاری کا مقبرہ پاس ہی تھا - شام کو وہاں جاکر بیٹھ جاتے ـــــ کچھ گپیں ہوتیں ـــــ کچھ سیاسی گفتگو اور باقی شعر و شاعری - اشفاق محمد خاں غزلیں گا کر سناتے تھے - ایک سماں بندھ جاتا ـــــ اسی زمانے میں رشید نعمانی صاحب، عتیق احمد صاحب (جو مدرسہ ثانوی میں استاد تھے - بعد میں انگلستان چلے گئے اور سرزمینِ انگلستان کا ایسا جزو ہوئے کہ پھر اسے الگ نہ کیا جا سکتا تھا) ان کی بیگم مشیر فاطمہ (وہ اب جامعہ نرسری کی نگراں ہیں)، بیگم کنور محمد اشرف اور ان کے صاحبزادے، اور کمال احمد صدیقی (ممتاز شاعر، اب آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہیں) ـــــ سے ملاقات ہوئی - چند ہفتوں کے انتظار کے بعد مجھے اسٹاف کوارٹرز میں ایک مکان مل گیا ـــــ لیکن تعمیر کا کام ابھی جاری تھا - خدا خدا کر کے یہ عمارت کسی حد تک رہنے کے لائق ہوئی اور میں نے ایک کوارٹر میں، (جو میرے نام پر وفیسر محمد مجیب نے الاٹ کیا تھا) جاکر اپنی چادر بچھا دی - کیوں کہ یہی ہمارا کل سرمایہ تھا - جامعہ ملیہ کی زندگی درویشانہ تھی اور میرے مزاج سے میل کھاتی تھی ـــــ (مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں اس کی تلاش میں برسوں سے مارا مارا پھر رہا تھا) چنانچہ میں وہاں پہنچتے ہی چند روز میں اس ماحول سے کچھ ایسا مانوس ہو گیا تھا کہ مجھے جامعہ کے لوگوں سے گھلنے ملنے میں زیادہ وقت نہ ہوئی - مجھے ایسا لگا کہ میں کانِ نمک میں پہنچ کر نمک ہو گیا ہوں - یہاں لوگ ایک دوسرے سے بڑی یگانگت اور محبت سے ملتے تھے - یہاں بڑے چھوٹے کا کوئی فرق نہ تھا - سب انسانی رشتے سے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے تھے -

جب میں جامعہ اسٹاف کوارٹرز میں آگیا تو ایک روز حیرت میں رہ گیا کہ مجھ سے بھی زیادہ چھوٹے قد کے ایک صاحب نظر آئے - تعارف ہوا تو پتا چلا کہ

www.taemeernews.com

ارے یہ تو بچّوں کے مشہور شاعر مولوی محمد شفیع الدین نیّر ہیں ـــــ میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا ـــــ یا تو مولانا حسرت موہانی کو دیکھ کر یقین نہ آیا تھا کہ یہ حسرت موہانی ہیں یا پھر اب مولوی شفیع الدین نیّر کو دیکھ کر خیال آیا کہ ارے ایسے ہوتے ہیں شفیع الدین نیّر ـــــ بالکل یہی کیفیت اک ذرا فرق کے ساتھ حامداللہ افسر کے ساتھ پیش آئی تھی۔ بچپن سے افسر کی نظمیں پڑھا کرتا تھا اور یہ خیال بھی نہ تھا کہ وہ زندہ بھی ہوں گے۔ پھر جب اتفاقاً ان کے ساتھ ملاقات ہوئی تو مجھے شوکت تھانوی کی بات یاد آئی جو انھوں نے افسر میرٹھی کے بارے میں لکھی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ساری عمر ریفریجریٹر میں گزار دی۔ ہاں تو نیّر صاحب کا کلام نہ جانے کب سے پڑھ رہے تھے اور اب وہ سامنے موجود تھے۔ جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی اور بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ ایک معمّر بچّے سے ملاقات ہو گئی ہے نیّر صاحب بڑی محبّت سے ملے اور ذرا سی دیر میں اتنی بہت سی باتیں کر ڈالیں کہ میرے لیے ان کو سمیٹنا مشکل ہو گیا۔ جامعہ کے حالات بتائے۔ اپنی زندگی کے خاص خاص واقعات سنائے۔ مجھے ایسا لگا کہ اگر میں ایک ہفتہ ان کے ساتھ رہوں تو نیّر صاحب مجھے سب کچھ بتا دیں گے جو وہ جانتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان سے مل کر قربت کا احساس ہوا۔ یوں بھی جامعہ کے اندر اتنی اپنائیت پائی تھی کہ ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہ ہو سکتا تھا لیکن نیّر صاحب نے تو جو ذرا بہت کمی رہ گئی تھی وہ بھی پوری کر دی۔

نیّر صاحب بے حد خوش ہوتے جیسے میرے پڑوس میں ہونا کوئی بڑی سعادت تھی۔ میرا مکان قریب تھا۔ کبھی خود آتے اور کبھی میں بھی ان کے یہاں چلا جاتا۔ میری عادت رات گئے تک پڑھنے کی ہے۔ یہ عادت علی گڑھ کی دین ہے کیوں کہ یہاں تو بقول نوح ناروی "جب شام ہو جاتی ہے تو سورج نکلتا ہے"

www.taemeernews.com

عام طور پر لوگ ۱۱ بجے کے بعد سونے کے بارے میں سوچتے ہیں - ہاں تو میری یہ عادت جامعہ میں بھی رہی - اتّفاق کی بات کہ نیّر صاحب کا بھی یہی عالم تھا — چنانچہ ۱۱ بجے کے بعد جب وہ ٹہلنے نکلتے تو میرے گھر پر ضرور دستک دیتے - میں اوپر کی منزل سے اُتر کر نیچے آتا - دروازہ کھولتا اور نیّر صاحب پھٹ پھٹ اور مجھ سے پہلے اوپر کے کمرے میں پہنچ جاتے - جاڑوں کے زمانے میں لحاف میں گھُس جاتے اور باتیں شروع کر دیتے ——— "ارے میں نے آپ کو بے وقت پریشان کیا ——— آپ کوئی کام کر رہے ہوں گے"

میں کہتا ——— "نہیں نیّر صاحب ایسی کوئی بات نہیں ہے — گویا میں بلا وجہ رات کو جاگ رہا تھا"

نیّر صاحب کہتے ——— "دراصل اس وقت صرف آپ کے یہاں روشنی نظر آتی ہے اس لیے چلا آیا" ——— جب وہ ایم - اے کا امتحان دے رہے تھے تو جو کچھ پڑھتے وہ میرے سامنے دہراتے ——— یہ بتانے کو کہ کیا کیا پڑھا - اور بتانے کا انداز ایسا ہوتا جیسے مجھ سے بات نہ کر رہے ہوں، کہیں تقریر کر رہے ہوں - اور پھر خود کہتے ——— "پرویز صاحب! آپ کی وجہ سے مجھے امتحان کی تیاری میں بڑی مدد ملتی ہے" پھر جب وہ علی گڑھ سے اُردو کا امتحان دے کر آئے تو اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے میرے پاس آئے اور کہنے لگے — "پرویز صاحب! مجھ سے رشید صاحب نے بچّوں کے ادب کے بارے میں ایک سوال کیا تھا - میں نے آپ کا نام لیا اور آپ کے کاموں کا ذکر کیا"

میں نے کہا ——— "نیّر صاحب! یہ صرف آپ کی محبّت ہے ورنہ میں کیا اور میرا کام ہی کیا ———"

ستمبر ۱۹۵۱ء سے مکتبہ جامعہ کے مینجنگ ڈائرکٹر حامد علی خاں صاحب کے

www.taemeernews.com

دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ "پیام تعلیم" کو دوبارہ شروع کیا جائے۔ چنانچہ اس کی ادارتی اور انتظامی کاموں کی ساری ذمہ داری انھوں نے میرے سپرد کردی۔ میں نے اپریل ۵۶ء تک اس فرض کی ادائگی کی اور مئی ۵۶ء میں استعفیٰ دے کر علی گڑھ آگیا۔ چنانچہ پھر یہ رسالہ بند رہا۔ اس کے بعد اس کا تیسرا دور جناب حسین جیّاں صاحب کی ادارت میں شروع ہوا۔

پھر تو پیام تعلیم کی ادارت کے دوران نیّر صاحب سے میری برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں مولوی محمد شفیع الدین نیّر صاحب کے بارے میں سب کچھ جان گیا تھا۔ نیّر صاحب زندگی میں کوئی راز نہ رکھ سکتے تھے۔ کم سے کم اپنا تو کوئی بھید ان کے پاس محفوظ نہ تھا۔ آج کل تو لوگوں کا عالم یہ ہے کہ چاہے اپنے گھر میں وہی پہلے ہوں جنھوں نے اسکول کی تعلیم حاصل کی ہو ——— لیکن کہتے یہی ہیں کہ ہمارے باپ دادا بڑے عالم فاضل تھے۔ نیّر صاحب جب اپنی بچپن کی مجبوریوں کا ذکر کرتے تو یہ ضرور کہتے ——— بھائی میرے باپ خود پڑھے لکھے نہ تھے ——— ان کا نام حکیم الدین تھا۔ وہ پولیس کے محکمے میں چوکیدار تھے، بعد میں ترقی کرتے کرتے کانسٹبل ہو گئے۔ یہ بات آج کی نہیں، بہت پہلے کی ہے۔ ان کے والد کا انتقال ۱۹۱۰ء میں ہوا۔ اس وقت نیّر صاحب کی عمر سات سال کی تھی[1]۔ وہ اترولی ضلع علی گڑھ کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آبا و اجداد خراسان سے آئے تھے بلکہ وہ تو کہتے تھے کہ میرے اجداد نومسلم تھے۔ شاید کایستھوں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ———

ڈاکٹر سیفی پریمی لکھتے ہیں:

"روایت ہے کہ مورثِ اعلا کایستھ تھے۔ اس خاندان میں موہن لال بھٹناگر کا نام کافی مشہور ہے۔ بعد میں کسی بزرگ نے مذہبِ اسلام قبول کرلیا تھا۔ اس

[1] نیّر صاحب کی پیدائش ۹ فروری ۱۹۰۳ء کو جمعرات کے دن ہوئی۔

www.taemeernews.com

ضمن میں ایک رشتہ دار کی تحریر ملتی ہے لیکن کوئی سرکاری دستاویز محفوظ نہیں"۔ انھوں نے اپنا خونی رشتہ آلِ رسول سے جوڑا، نہ حضرت ابوبکر صدیق' اور حضرت عمر اور حضرت عثمان سے ——— انھوں نے زندگی بھر کنواں کھودا۔ پانی نکالا، خود بھی پیا اور دوسروں کو بھی پلایا۔

وہ لوگ جو باپ دادا کے وسیلے سے تعلیم پاتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ وہ قسمت سے پڑھ لکھ گئے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ذرا بڑے ہوئے اور مدرسے میں بٹھا دیے گئے اور بڑے ہوئے تو اسکول اور کالج میں داخل کردیے گئے۔ گویا بیس سال کی عمر تک یہ پتا نہ چلا کہ روپیا کہاں سے آتا ہے۔ یہ قسمت نہیں تو اور کیا ہے۔

پانچ سال کی عمر میں شفیع الدین کی بسم اللہ ہوئی۔ قاعدے اور عم یتسآءلون کے سپارے پڑھے۔ باقاعدہ پڑھائی مصباح الاسلام اتر دلی میں ہوئی۔ یہاں گلزارِ دبستان اور گلستانِ سعدی کے پانچ باب پڑھے ——— عجب اتفاق ہے۔ میں نیّر صاحب سے کہا کرتا تھا کہ میری ابتدائی تعلیم بھی ان ہی کتابوں کے سہارے ہوئی۔ دراصل اس زمانے میں یہی بنیادی تعلیم کی کتابیں تھیں جنھوں نے برسوں مسلمان گھرانوں کے بچّوں کی ذہنی تربیت بھی کی اور ان کے توسّط سے انھوں نے اردو اور فارسی زبانوں کو سیکھا بھی ——— مدارس کے مولوی تو اپنا کام کرتے ہی تھے لیکن ان کتابوں نے سہارے کا کام کیا۔ آج درس و تدریس کے نئے نئے خیالات سامنے آگئے لیکن پھر بھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ ان کتابوں کے بغیر ہماری ابتدائی تعلیم ادھوری ہے۔ جب بچے بہت چھوٹے ہوتے ہیں اور ماں باپ ان کو چلنا سکھاتے ہیں تو ان کو "گڈولنا" دے دیتے ہیں۔ یہ لکڑی کی تین پہیّوں کی چھوٹی گاڑی ہوتی ہے۔ بچے پہلے اس کے سہارے چلتے ہیں اور پھر جب وہ اپنے

www.taemeernews.com

پانو سنبھالنے لگتے ہیں تو اس 'گڈولنے' کو چھوڑ کر چلتے ہیں ——— یہ بات میں نے اس لیے کی کہ میرے نزدیک یہ کتابیں (جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے) 'گڈولنے' کی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں نہ جانے کیوں کبھی کبھی سوچنے لگتا ہوں کہ اگر بچپن میں یہ کتابیں نہ پڑھائی جاتیں تو ہم گر پڑتے۔

نیر صاحب کا مزاج بڑا نستعلیق تھا ——— وہ زندگی میں سلیقے، صفائی اور شستگی کے قائل تھے اور شاید اسی نے ان کو خوش نویسی کی تربیت کی طرف مائل کیا لیکن تعلیم کی کشش نے ان کو ایک پیشہ ور خوش نویس بننے سے روک دیا۔ انھوں نے نہ دائیں دیکھا نہ بائیں ——— وہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کے قائل نہ تھے کیونکہ الف لیلہ میں ایک کہانی میں شاید انھوں نے پڑھا تھا کہ پیچھے دیکھنے سے انسان پتھر کا ہو جاتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں نیر صاحب سے محبت کرنے والوں کو الف لیلہ کی اس کہانی کا آخری حصّہ سناؤں:

تین بہن بھائی تھے۔ ——— بھائیوں کے نام فرید اور فیروز تھے اور بہن کا نام فیروزہ تھا۔ تینوں ہل جُل کر رہتے۔ فرید اور فیروز تو شکار کھیلنے چلے جاتے اور فیروزہ اکیلی گھر میں رہتی اور اپنے باغ کی دیکھ بھال کرتی۔ ایک دن جب وہ گھر میں اکیلی تھی تو وہاں ایک بوڑھی عورت آئی۔ فیروزہ نے اسے اپنا خوبصورت باغ دکھایا اور اس کی خوب خاطر مدارات کی۔ اسے خوب مزے مزے کی چیزیں کھلائیں۔ بڑھیا کھا پی کر بہت خوش ہوئی اور اس نے فیروزہ کو بڑی دعائیں دیں۔ فیروزہ نے پھر اسے لے جا کر ایک بڑے خوبصورت پیڑ کے نیچے بٹھایا اور اس سے پوچھا ——— "بڑی بی تم تو دنیا میں جگہ جگہ گھومتی پھرتی

www.taemeernews.com

ہو، تم نے تو بہت سے اور طرح طرح کے باغ دیکھے ہوں گے، اب یہ بتاؤ کہ تم کو ہمارا باغ کیسا لگا؟"

بڑھیا تھوڑی دیر تو خاموش رہی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو، پھر بولی ——— "میری پیاری بیٹی! میری ساری زندگی دنیا کی سیر کرتے گزری ہے۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتی ہوں کسی جگہ کبھی ٹھہرتی نہیں ہوں۔ لیکن تمھارے باغ کو دیکھ کر میرا جی بہت خوش ہوا۔ پھر تمھاری شکل و صورت کی لڑکی تو میں نے دیکھی ہی نہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ جس باغ میں تم جیسی لڑکی ہو، اس میں اگر وہ تین چیزیں اور ہوتیں، جن کی مثال دنیا میں کہیں اور نہیں ہے تو پھر کتنا اچھا ہوتا۔"

فیروزہ سوچنے لگی کہ آخر وہ کون سی تین چیزیں ہیں، جن کی کمی ہے اور جو ایسی عجیب و غریب ہیں۔ اس نے بڑھیا سے پوچھا ——— "بڑی بی! وہ ایسی کون سی تین چیزیں ہیں۔ مجھے بتاؤ۔ میں اپنے بھائیوں سے کہہ کر انھیں حاصل کر دوں۔"

"میں ضرور بتاؤں گی ——— تم نے جس طرح میری خاطر مدارات کی، اس کا میرے دل پر بڑا اثر ہوا ہے۔" یہ کہہ کر بڑھیا نے کہا ——— "ایک تو ایسی چڑیا ہے کہ جب وہ گاتی ہے تو ساری چڑیاں اس کے سامنے جمع ہو جاتی ہیں اور سب مل کر گاتی ہیں۔ اسے بلبل ہزار داستاں کہتے ہیں ——— دوسری چیز ——— گانے والا پودا ہے کہ جب ہوا چلتی ہے تو اس پیڑ کی ایک ایک پتی سے بڑی اچھی آواز نکلتی ہے، جیسے بہت سے

www.taemeernews.com

ساز ایک ساتھ بجنے لگے ہوں ——— اور تیسری چیز ہے سنہرا پانی ——— جیسے سونے کے موتی ٹپک ٹپک کر گر رہے ہوں۔"

بڑھیا نے یہ تینوں عجیب و غریب چیزیں بتانے کے بعد کہا ——— "بیٹی! اگر تمھارے باغ میں یہ تینوں چیزیں آجائیں تو بس تمھیں کسی چیز کی ضرورت باقی نہ رہے۔"

فیروزہ شہزادی نے کہا ——— "بڑی بی! یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ تینوں چیزیں کہاں ملیں گی۔"

بڑھیا نے کہا ——— "اس کے لیے تو ہندوستان کا سفر کرنا پڑے گا۔ اگر کوئی جائے تو اس سے کہنا کہ مشرقی سڑک پر روانہ ہو جائے، چلتا رہے، چلتا رہے، بیس روز تک سفر کرتا رہے۔ اس کے بعد جو آدمی سب سے پہلے نظر آئے اس سے کہے۔ 'ارے بھائی! بولنے والی چڑیا، گانے والا پودا، اور سنہرا پانی کہاں ہیں ———' اب وہ اجنبی جو راستہ بتائے، اسی پر روانہ ہو جائے۔ خدا کرے کہ تمھاری مراد پوری ہو جائے۔"

یہ کہہ کر بڑھیا منہ ہی منہ میں کچھ کہتی ہوئی چلی گئی، جیسے فیروزہ کو دعائیں دے رہی ہو۔ جب وہ بڑھیا چلی گئی تو اس کا دل چاہنے لگا کہ ان تینوں عجیب و غریب چیزوں کو دیکھے۔ بلکہ کسی طرح ان کو حاصل کرے۔ اب اس کو اپنا باغ ذرا بھی اچھا نہ لگا اور ذرا سی دیر بعد وہ باغ کی روشوں پر چلتے چلتے رونے لگی اور اس کی آنکھوں سے جو آنسو ٹپکے وہ موتیوں کی

www.taemeernews.com

لکیریں بن گئے۔

ذراسی دیر کے بعد فیروز اور فرید شکار سے واپس آگئے۔ وہ اپنی بہن کو ڈھونڈنے باغ میں گئے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ روش پر موتیوں کی قطار تھی اور انھوں نے ایک دوسرے سے کہا ——— "آج کوئی بات ہے جو ہماری بہن رو رہی ہے ایسی کون سی بات ہوگئی، جس نے اُسے اُداس کر دیا۔"

ذراسی دیر میں انھیں فیروزہ نظر آئی۔ فیروزہ نے انھیں دیکھ کر سر اُٹھایا اور بھائیوں کو پریشان دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی اور اس کے ہونٹوں پر گلاب کا ایک چھوٹا سا پھول کھِل گیا وہ بولی ——— "میرے پیارے بھائی! ——— مجھے اب اپنا یہ باغ اچھا نہیں لگتا کیوں کہ یہاں نہ تو بلبل ہزار داستان ہے، ——— نہ گانے والا پپیہا اور نہ سنہرا پانی۔"

اس کے بعد فیروزہ نے اپنے بھائیوں کو بڑھیا کے آنے اور اس کی خاطر مدارات کرنے اور پھر اس کی زبانی ان تینوں چیزوں کے بارے میں معلوم ہونے کا حال سنایا۔ دونوں بھائیوں کو سن کر حیرت ہوئی۔ پھر بولے ——— "بہن! تم پریشان مت ہو ایسی کون سی چیز ہے جو ہم تمھارے لیے نہیں لا سکتے۔ اگر اس کے لیے ہمیں کوہ قاف بھی جانا پڑے تو ہم وہاں بھی چلے جائیں گے تم بالکل پریشان نہ ہو۔ اپنے آنسو پونچھو اور ہمیں یہ بتاؤ کہ بڑھیا نے اس کا کوئی پتا بھی بتایا ہے؟"

فیروزہ نے بڑھیا کے بتائے ہوئے پتے کا ذکر کیا۔

www.taemeernews.com

دونوں بھائیوں نے ایک آواز سے کہا ——— "پیاری بہن! تم گھر میں جاؤ۔ ہم ابھی اسی طرف جاتے ہیں اور تمھارے لیے یہ تینوں چیزیں لے کر آتے ہیں۔"

فیروزہ نے کہا ——— "میرے بھائی، مت جاؤ۔ میں ان کے بغیر بھی جی لوں گی۔ مگر تم لوگ چلے گئے تو میں کیا کروں گی۔"

فرید نے کہا ——— "بہن! تم فکر مت کرو۔ میں اکیلا جاؤں گا۔ میرا گھوڑا تیار ہے — فیروز تمھارے پاس رہے گا۔" یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہوگیا۔

فیروزہ نے جاکر گھوڑے کی باگ پکڑ لی ——— "بس اُتر جاؤ۔ اس سفر کا خیال چھوڑ دو۔ کیونکہ یہ سفر خطرناک ہے، مجھے نہ بلبل ہزار داستان کی ضرورت ہے اور نہ گانے والے پیڑ اور نہ سنہرے پانی کی۔"

فرید نے پیار سے کہا ——— "میری پیاری بہن! تم بالکل پریشان نہ ہو۔ میں بہت جلد آؤں گا۔ خدا میری حفاظت کرے گا۔ میں تم کو ایک چاقو دیتا ہوں۔ تم جانتی ہو، اس کا دستہ کیسا بنا ہے۔ اس کے دستے پر جو موتی ہیں، یہ دراصل وہ آنسو ہیں جو تمھاری آنکھوں سے پہلی بار ٹپکے تھے۔ اس چاقو کا کمال یہ ہے کہ جب تک یہ صاف ستھرا ہے، سمجھو کہ میں خیریت سے ہوں۔ البتہ جب اس پر زنگ آجائے تو سمجھو کہ میری جان خطرے میں ہے۔ میں قید ہوگیا ہوں ——— لیکن اگر خون کے قطرے آجائیں تو جان لینا کہ میں اب زندہ نہیں ہوں۔ اگر ایسی بات ہو

www.taemeernews.com

جائے تو بس خدا سے میرے لیے دعا کرنا اور صبر سے کام لینا۔"

اس نے وہ چاقو فیروزہ کو دے دیا اور بڑھیا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔

فرید بیس دن اور بیس راتوں تک چلتا رہا۔ پھر اسے ایک پہاڑ نظر آیا۔ وہیں پہاڑ کے نیچے ایک پیڑ تھا اور اس کے نیچے ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔

فرید نے کہا ——— "بابا ——— ہمارا سلام قبول کرو۔"

بوڑھے نے سر اٹھایا، اس کی بھویں آنکھوں کو چھپائے ہوئے تھیں۔ اس نے دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر اس نے منہ کھولنا چاہا لیکن مونچھوں کے بال سامنے آگئے۔ اس کو ایسا لگا جیسے اس کی آواز بالوں میں الجھ کر رہ گئی۔

فرید نے سوچا کہ کیوں نہ اس بوڑھے کی مدد کی جائے۔ اس نے اپنی جیب سے قینچی نکالی اور بولا ——— "بابا! مجھے اجازت دو کہ میں تمہارے بال کاٹ دوں اس لیے کہ تم کو تو خدا کی یاد ہی سے فرصت نہیں ہے کہ اپنا خیال کرو۔"

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ فرید نے بڑھ کر جلدی جلدی بوڑھے کے بال کاٹے۔ اب بوڑھے کا چہرہ نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ناخن کاٹے اور بولا ——— "بابا! اب آپ بالکل تر و تازہ ہو گئے۔"

بوڑھے نے فرید کو غور سے دیکھا اور خوش ہو کر کہا ———
"بیٹا خدا تم کو خوش رکھے کہ تم نے مجھ بوڑھے کی خدمت کی۔ اب

www.taemeernews.com

بتاؤ تمھیں کیا چاہیے اور تم اس ویرانے میں کیوں اور کس کام سے آئے ہو۔"

فرید نے کہا ——— "بابا! میں بہت دور سے آرہا ہوں۔ مجھے بلبل ہزار داستاں، گاتے ہوئے پیڑ اور سنہرے پانی کی تلاش ہے۔ کیا تم مجھے اس کا پتا بتا سکتے ہو۔"

بوڑھے نے کہا ——— "بیٹا! مجھے اس کا پتا اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن تم نے میرے ساتھ جو نیکی کی ہے اس کے بدلے میں میں تم کو اتنے خطرناک راستے پر نہیں جانے دینا چاہتا۔ بہتر ہے کہ تم جس راستے سے آئے ہو، اسی راستے پر پلٹ جاؤ۔ تمھارے جیسے کتنے نوجوان ادھر ان چیزوں کی تلاش میں گئے لیکن آج تک کوئی واپس نہیں آیا۔"

فرید نے کہا ——— "بابا! تم اس کی فکر نہ کرو۔ خدا نے مجھے عقل دی ہے اور طاقت بھی۔ بس تم تو مجھے راستہ بتا دو۔"

بوڑھے نے کہا ——— "بیٹا! تم کتنے ہی طاقت ور کیوں نہ ہو، لیکن جو دشمن نہ دکھائی دے، اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہو اور پھر جب کہ ان کی تعداد ایک دو نہیں ہزاروں ہے۔"

فرید نے کہا ——— "بابا! میں دنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈرتا۔ اگر مجھے مرنا ہے تو کہیں بھی مر سکتا ہوں۔ اس لیے تم اس کی فکر مت کرو۔ میں زندگی بھر تمھارا احسان مانوں گا۔"

جب بوڑھے نے دیکھا کہ فرید اپنے فیصلے پر اٹل ہے اور کوئی بات نہیں مانتا تو پھر اس نے اپنی جھولی میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں

www.taemeernews.com

سے ایک فولاد کی گیند نکلی۔ اس نے یہ گیند فرید کو دے کر کہا۔
"تم اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ اور اس گیند کو سامنے پھینک دو۔ یہ گیند اپنے آپ چلے گی۔ جس جس راستے پر یہ گیند چلے تم اپنے گھوڑے کو اسی راستے پر لے چلو۔ جہاں یہ رُک جائے تم بھی رُک جانا۔ اس کے بعد اپنے گھوڑے کی لگام کو اسی گیند سے باندھ دینا۔ اس سے باندھنے کا اثر یہ ہوگا کہ تمھارا گھوڑا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوگا۔ اس کے بعد تم اس پہاڑ پر چڑھ جانا جس کی چوٹی یہاں سے دکھائی دے رہی ہے۔ تم کو دونوں طرف کالے کالے پتھر دکھائی دیں گے ——— اب تم کو طرح طرح کی آوازیں سُنائی دیں گی ——— یہ آوازیں کسی جھرنے کی نہیں ہیں ——— یہ آوازیں ہواؤں کی بھی نہیں ——— یہ آوازیں ہیں ان کی جو دکھائی نہیں دیتے اور اس پہاڑ کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ آوازیں اتنی بھیانک ہوتی ہیں کہ آدمی کانپ اٹھتا ہے۔ یہ بُرا بھلا کہتی ہیں چیختی چلاتی ہیں ——— ان کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔ اب اگر تم نے مڑ کر دیکھا تو پتھر کے ہو جاؤ گے ——— کالے پتھر کے۔ جیسے کہ وہ پتھر ہیں۔ یہ لوگ تمھاری طرح ان تینوں چیزوں کی آرزو لے کر وہاں پہنچے ——— لیکن انھوں نے میری بات نہ مانی۔ مُڑ کر دیکھا اور پتھر کے ہو گئے۔ اگر تم سیدھے وہاں پہنچ گئے تو گویا تم نے اپنی منزل پالی۔ تم کو سامنے ایک پنجرہ دکھائی دے گا جس میں ایک چڑیا بند ہوگی، یہی بلبل ہزار داستاں ہے۔ تم

www.taemeernews.com

اس سے پوچھو گے تو یہ بتا دے گی کہ گاتا ہوا پیڑ اور سنہرا پانی کہاں ہیں - اب جاؤ خدا حافظ "—— یہ کہہ کر بوڑھا خاموش ہوگیا -

فرید گیند لے کر گھوڑے پر سوار ہوا - اس نے گیند سامنے راستے پر پھینکی - گیند چلنے لگی - یہ گیند عجیب و غریب راستوں سے گزر رہی تھی - لیکن فرید کا گھوڑا بہت تیز تھا - اس نے بھی ہر راستے کو پھرتی سے پار کیا - یہاں تک کہ وہ گیند پہاڑ کے بالکل نیچے آکر رک گئی - فرید نے اتر کر گھوڑے کی لگام گیند سے باندھی گیند سے لگام کو باندھنا تھا کہ گھوڑے کے پانو اپنی جگہ پر جم گئے جیسے کسی نے کیل سے جڑ دیا ہو -

اب فرید پہاڑ پر چڑھنے لگا - اسے کوئی آواز سنائی نہ دی - البتہ اسے اپنے دائیں بائیں کالے کالے پتھر نظر آئے جن کے بارے میں بوڑھے نے بتایا تھا - پھر اچانک چٹانوں میں ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں - یہ آوازیں بڑھتے بڑھتے بڑی بھیانک ہوگئیں - ایسی خوفناک آوازیں اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں - ایک آواز آئی —— "کیا کام ہے؟ کیا کام ہے؟ بتاتا کیوں نہیں" —— کوئی آواز آئی —— "گرا دو" —— "گرا دو" —— "جان سے مار ڈالو بزدل کو" —— بعض آوازیں رونے کی تھیں، بعض ہنسنے کی تھیں -

فرید بڑی بہادری سے چڑھتا چلا گیا —— لیکن ذرا سی دیر میں یہ آوازیں اور زیادہ بھیانک اور خوفناک ہوگئیں -

www.taemeernews.com

کبھی تو ایسا لگتا کہ یہ آوازیں بہت دُور سے آ رہی ہیں اور کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے بہت پاس سے آ رہی ہیں۔ اب تو فرید ان آوازوں سے ڈرنے لگا۔ وہ بوڑھے کی نصیحت کو بھول گیا۔ ایک مرتبہ اس نے مڑکر دیکھا۔ مڑکر دیکھنا تھا کہ وہ وہیں کا وہیں جم کر رہ گیا اور پھر اوروں کی طرح پتھر کا ہوگیا۔

جیسے ہی فرید کا جسم پتّھر کا ہوا۔ اس کا گھوڑا بھی پتّھر کا ہوگیا اور جب گھوڑا پتّھر کا ہوا تو پھر فولاد کی گیند لڑھکتی ہوئی واپس بوڑھے کے پاس چلی گئی۔

جب فیروزہ نے اپنا چاقو نکال کر دیکھا تو اس میں زنگ لگا ہوا تھا۔ فیروزہ اس کو دیکھ کر گھبرا گئی، زار و قطار رونے لگی ——— ہائے میرا بھائی! میں نے تم کو کیوں جانے دیا؟ میں نے تم کو روکا نہیں۔ ہائے میرا بھیّا! میری وجہ سے تمھاری جان خطرے میں پڑ گئی۔ اس کے بھائی فیروز نے جو یہ دیکھا کہ اس کے بھائی کی جان خطرے میں ہے تو وہ بھی رونے لگا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور فیروزہ سے کہا: "میری پیاری بہن! پریشان مت ہو۔ میں بھائی کو ڈھونڈ کر لاؤں گا میں اسے مشکل سے نکالوں گا اور تمھارے لیے وہ تینوں چیزیں بھی لاؤں گا۔"

یہ سُن کر فیروزہ اور پریشان ہوگئی۔ اس نے کہا ——— "میرے بھائی! اب تم ہی میرا سہارا ہو۔ تم بھی چلے گئے تو میرا کیا ہوگا۔ میں اکیلے کیسے زندہ رہوں گی ——— مجھ کو

www.taemeernews.com

کچھ نہیں چاہیے۔"

لیکن فیروزہ کے روکنے کے باوجود فیروز چلا گیا۔ البتہ اس نے جانے سے پہلے اسے موتیوں کا ہار دیا۔ یہ ہار ان موتیوں سے بنا تھا، جب فیروزہ بچپن میں دوسری بار روئی تھی۔ اس کے آنسو موتی بن گئے تھے۔ فیروز نے جاتے وقت اسے یہ ہار دے کر کہا ——— "اگر اس ہار کے موتی ایک دوسرے سے جُڑ جائیں تو سمجھ لینا کہ میرا حال بھی اپنے بھائی جیسا ہو گیا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ بیسویں روز اسے وہی بوڑھا ملا۔ بوڑھے سے جب فیروز نے اپنی بات کہی تو اس نے روکا اور کہا ——— "بیٹا! اپنے گھر واپس چلے جاؤ ورنہ تمھارا بھی وہی حال ہوگا جو تمھارے بھائی کا ہوا۔ ابھی تک وہاں کا گیا ہوا کوئی واپس نہیں ہوا۔"

لیکن فیروز نہیں مانا۔ وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ آخر بوڑھے نے اپنے تھیلے میں سے گیند نکال کر دے دی اور یہ گیند آگے آگے چلتی رہی اور پیچھے پیچھے فیروز کا گھوڑا ——— آخر پہاڑ کے بالکل نیچے جا کر یہ گیند رُک گئی۔ فیروز نے اپنا گھوڑا گیند سے باندھا اور پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ ذرا سی دیر میں آوازیں آنی شروع ہوئیں، وہی بھیانک آوازیں ——— یہ آوازیں اسے ڈرا دھمکا رہی تھیں ——— وہ بڑھتا رہا ——— بڑھتا رہا۔ ہر قدم کے ساتھ آوازیں بھی خوفناک ہوتی چلی گئیں ——— لیکن اچانک اس کو ایسا لگا کہ جیسے اس کا بھائی اس کو آواز دے

www.taemeernews.com

رہا ہے۔" میرے بھائی مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو؟"

جیسے ہی فیروزنے فرید کی آواز سنی، اس نے مڑ کر دیکھا سارا جسم پتھر کا ہو گیا۔ یہاں فیروزہ کا یہ حال تھا کہ ہر وقت وہ اس ہار کو دیکھتی رہتی۔ اکیسویں دن اس ہار کے سب موتی ایک دوسرے سے جڑ گئے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی اور پھر زور سے چیخی ——— "ہائے میرا بھائی ——— ہائے میں نے اپنی بے وقوفی سے اپنے بھائیوں کو کھویا۔"

جب فیروزہ کافی رو دھو چکی تو اس نے سوچا کہ میرے بھائی مصیبت میں پھنسے ہیں مجھے خود ان کو مصیبت سے نکالنا چاہیے ——— یہ سوچ کر اس نے جلدی جلدی مردانہ کپڑے پہنے، مردانہ بھیس بدلا، اور گھوڑے پر بیٹھ کر سیدھی اسی راستے پر روانہ ہو گئی۔

بیس روز بعد فیروزہ اسی پیڑ کے نیچے پہنچی جہاں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے جاتے ہی کہا ——— "بابا! کیا تم نے دو خوبصورت نوجوانوں کو اس راستے پر جاتے دیکھا ہے، جو بلبل ہزار داستان، گاتے ہوئے پیڑ اور سنہرے پانی کی تلاش میں تھے۔"

ہاں بیٹی فیروزہ! وہ اسی راستے پر گئے ہیں۔ میرے روکنے کے باوجود نہیں مانے۔ اور ان کے ساتھ بھی وہی ہوا جو اُن سے پہلے اوروں کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بھی پتھر کے ہو گئے۔

www.taemeernews.com

بوڑھے کی زبان سے اپنا نام سُن کر فیروزہ حیرت میں رہ گئی لیکن پھر بوڑھے نے کہا ——— "جس نے تم کو ان تینوں چیزوں کے بارے میں بتایا۔ وہ سچ ہے۔ واقعی ان میں یہی خوبیاں ہیں لیکن بتانے والے نے تم کو اس خطرے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ان کا حاصل کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ ان کی حفاظت وہ طاقتیں کر رہی ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ انسان کے لیے ان پر فتح پانا، ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

فیروزہ نے کہا ——— "بابا! میں اپنے بھائیوں کے لیے بے چین ہوں۔ میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میرے سب کچھ وہی ہیں۔ تم مجھے راستہ بتا دو۔ یہ میرے اُوپر بڑا احسان ہوگا۔ ایک بہن کی بات مان لو۔"

بوڑھے نے کہا ——— "اے شہزادی فیروزہ ———! لو یہ گیند ہے۔ یہ تم کو راستہ بتائے گی اور تمھیں منزل تک پہنچا دے گی۔ لیکن تم اپنے بھائیوں کو اس وقت تک نہیں چھڑا سکتیں جب تک کہ ان تینوں چیزوں پر قبضہ نہ کر لو، جن کے لیے تمھارے بھائی گئے تھے ——— اے شہزادی! میں تجھے دعا دیتا ہوں، اس لیے کہ تم اپنے بھائیوں کی محبت میں جا رہی ہو۔ خدا تیری مدد کرے گا۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے وہی گیند فیروزہ کے حوالے کر دی۔ اور اس کے بعد کچھ روئی جیب سے نکالی اور اس سے کہا۔ "بیٹی! اپنا سر جھکانا ———" فیروزہ نے سر جھکایا۔ بوڑھے

www.taemeernews.com

نے اس کے دونوں کانوں میں خوب اچھی طرح روئی ٹھونس دی۔
اور کہا ——— "بیٹی فیروزہ! جاؤ پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ اب کوئی آواز تمھارے کان میں نہیں آئے گی۔ نہ محبت کی اور نہ نفرت کی۔"

فیروزہ نے گیند پھینک دی۔ گیند اسی طرح پہاڑ کے نیچے تک پہنچی۔ فیروزہ بھی گھوڑے پر سوار، اس کے پیچھے وہاں آگئی۔ جیسے ہی گیند رُکی، فیروزہ نے گھوڑے کو گیند سے باندھ دیا اور پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ ذرا سی دیر میں ان ہی آوازوں نے فیروزہ کا پیچھا کیا۔ لیکن فیروزہ کے کان میں تو روئی تھی، اسے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ وہ آگے بڑھتی رہی، بڑھتی رہی، اس کے پانو تھک کر شل ہو گئے لیکن وہ تیزی سے چلتی ہوئی چوٹی پر پہنچی۔ جیسے ہی وہ چوٹی پر پہنچی، ساری آوازیں اک دم سے رُک گئیں۔ فیروزہ کی نظر سامنے پنجرہ پر پڑی۔ یہ پنجرہ سونے کا تھا فیروزہ سمجھ گئی کہ یہ وہی بولتی ہوئی چڑیا ہے بلبل ہزار داستان۔ فیروزہ نے جلدی سے پنجرہ اٹھالیا ——— "میں نے تمھیں پالیا۔ اب بتاؤ تم کہاں جاؤ گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کانوں میں سے روئی نکال کر ایک طرف پھینکی۔ جیسے ہی اس نے کان سے روئی نکالی۔ چڑیا بولی

"میری فیروزہ ——— شہزادی فیروزہ ———!
میں تو تم سے زیادہ جانوں سلطان کی بیٹی میری مالک
میں اس کا ہر کہنا مانوں"

www.taemeernews.com

فیروزہ اس کو دیکھ کر اتنا خوش ہوئی کہ اپنی ساری تکلیف
بھول گئی۔ پھر بلبل سے بولی۔ ــــ" اے بلبل ہزار داستان!
سچ مچ تم اگر مجھے اپنا مالک سمجھتی ہو تو پھر ثابت کرو۔
بلبل فوراً بولی:

"فیروزہ ــــ شہزادی فیروزہ!
جو کہنا ہے سو کہہ کر دیکھ
پھر دیکھ میں کیسے تیرا کہنا مانوں"

فیروزہ نے کہا ــــ" اے بلبل! ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہ
گانے والا پیڑ کہاں ہے"
بلبل ہزار داستاں نے کہا:

"فیروزہ ــــ شہزادی فیروزہ!
اس پار پہاڑی کے جا کر دیکھ
اِک پیڑ وہاں پر سُندر سا
جس کی ہر پتّی ہر پھول اور ہر ایک کلی سے
مدھم مدھم گانے کی آواز نکلتی رہتی ہے"

جب فیروزہ وہاں پہنچی تو اسے بہت بڑا پیڑ دکھائی دیا۔
اتنا بڑا پیڑ ــــ اتنا بڑا پیڑ کہ اس کے نیچے پوری فوج آسکتی
ہے۔ فیروزہ گھبرا گئی کہ اتنا بڑا پیڑ کیسے اُکھاڑ کر لے جا سکتی ہے۔
بلبل اس کی پریشانی سمجھ گئی اور بولی: "شہزادی ــــ فیروزہ شہزادی
اس پیڑ کی تم اک شاخ کو توڑو
باغ میں لگ کر پیڑ بنے گا

www.taemeernews.com

اتنا گھنا اور اتنا ہی اُونچا
شاخ سے گویا پیڑ بنے گا"

فیروزہ کافی دیر تک پیڑ کا گانا سُنتی رہی۔ سچ مچ۔ ہر اک پتّی، ہر ایک کلی، ہر اک پھول سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

فیروزہ نے اس کی ایک شاخ توڑ لی اور اس کے بعد بُلبل سے پوچھا ——— "بی چڑیا ——— ! اب یہ تو بتاؤ وہ سنہرا پانی کدھر ہے؟"

بلبل ہزار داستاں بولی:

"شاخ کو لے کر پچھم جاؤ
چٹانوں میں اک دریا ہے
اس کا پانی پگھلے سونے جیسا
پچھم میں جیسے سُورج ڈوبا
رنگ ہے اس کا گہرا پیلا
اک برتن میں اس کو بھر لو"

فیروزہ آگے بڑھی تو کیا دیکھتی ہے کہ چٹانوں کے اندر ایک جگہ پانی بہہ رہا ہے جیسے پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہو۔ فیروزہ نے اس کو ایک برتن میں بھر لیا۔

یہ دونوں چیزیں لے کر فیروزہ پرندے کے پاس گئی اور بولی ——— "میری پیاری بلبل! اب ایک کام اور ہے جس کے لیے میں اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہوں!"

www.taemeernews.com

بلبل نے کہا:

"فیروزہ ——— شہزادی فیروزہ میری مالک
جو جی میں ہو وہ بات کہو
پھر دیکھ کیسے کہنا مانوں"

فیروزہ بولی ——— "میرے دونوں بھائی کہاں ہیں—
میرے بھائی ——— وہ کہاں ملیں گے؟"

بلبل نے کہا:

فیروزہ ——— شہزادی فیروزہ
بھائی تمھارے پتّھر بن کر
سیڑھی پر ہیں وہ بُت جیسے
اُن پر یہ سنہرا پانی چھڑکو
پھر بن جائیں گے وہ تم جیسے

فیروزہ نے تھوڑا سا پانی لیا۔ اب جس کالے پتّھر پر اس سنہرے پانی کی چھینٹیں ڈالتی ——— وہ پتّھر سے آدمی بن جاتا۔ اس طرح وہ تمام پتّھر آدمی بنتے چلے گئے اور اس کے دونوں بھائی بھی ان ہی میں سے تھے۔ وہ دوڑ کر اپنی بہن سے لپٹ گئے۔ باقی تمام لوگ جو پہلے پتّھر بنے ہوئے تھے، وہ فیروزہ کے سامنے آئے اور انھوں نے جُھک کر بڑے ادب سے سلام کیا۔ ان کے تمام گھوڑوں میں بھی جان پڑ گئی۔ اب فیروزہ آگے بڑھی اور اس کے ساتھ دونوں بھائی ——— اور ان کے پیچھے وہ تمام آدمی، غرض ایک قافلہ بن گیا۔"

www.taemeernews.com

"الف لیلہ" کی یہ کہانی نیّر صاحب کو بہت مرغوب تھی - وہ اکثر مجھ سے کہا کرتے تھے کہ میں اس کہانی کو بچّوں کے لیے لکھوں - میں نے ان کی یہ فرمایش اُن کی زندگی میں پوری کی ——— چنانچہ جب وہ علی گڑھ آئے تو مجھے اس کہانی کے لیے مبارک باد دی - میں نے کہا ——— "نیّر صاحب! یہ کہانی واقعی بڑی خوبصورت ہے اور بچّوں کے لیے لکھتے ہوئے مجھے بھی بہت مزا آیا ——— لیکن الف لیلہ میں اور بھی تو اچھی کہانیاں ہیں جن میں سے چند ایک کو میں نے بھی بچّوں کے لیے لکھا ہے ——— لیکن آپ کو یہ کہانی اتنی کیوں پسند ہے؟"

نیّر صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا ——— "اس میں کامیاب وہی لڑکی ہوتی ہے جو پیچھے مُڑکر نہیں دیکھتی ——— جو لوگوں کے شور و غل کی پروا نہیں کرتی ——— اور بالآخر اس طلسم کو توڑ دیتی ہے۔"

میں نے اس طویل کہانی کا ایک مختصر سا حصّہ لکھا ہے اور مجھے اس میں نیّر صاحب کی شخصیت نظر آ رہی ہے - انھوں نے کبھی زندگی بھر پیچھے مڑکر نہیں دیکھا - انھوں نے اپنے کام سے کام رکھا اور کامیابی حاصل کی - یہ سچ ہے کہ انھوں نے بہت روپیا پیسا نہیں کمایا ——— لیکن روپیا کمانا ان کی زندگی کا مقصد بھی تو نہیں تھا - روپے سے بے نیازی کا اندازہ ایک دلچسپ واقعے سے ہوتا ہے - یہ غالباً ۱۹۵۴ء کے آس پاس کی بات ہے - گرمیوں کی ایک دوپہر تھی - نیّر صاحب نے میرے یہاں دستک دی اور حسب دستور داخل ہوتے - کہنے لگے ——— "پرویز صاحب! آپ کو ایک خاص بات بتانے آیا ہوں - ہمارے آپ کے قاضی معزالدین احمد (مالک آزاد کتاب گھر - دہلی) حساب کے معاملے میں صاف ستھرے نہیں ہیں۔"

میں نے کہا ——— "یہ آپ نے کیسے اندازہ لگایا؟"

www.taemeernews.com

بولے ——— "انھوں نے میری متعدد کتابیں چھاپی ہیں۔ آج میں اتفاق سے ان کا حساب کر رہا تھا تو مجھے پتا چلا کہ ان کے ذمّے میرے سولہ سو روپے نکلتے ہیں اور وہ مجھ سے یہی کہتے رہے کہ بہت معمولی رقم ہے۔ چنانچہ میں اس وقت ان کے پاس جا رہا ہوں اور ان سے جا کر اپنے واجبات کا مطالبہ کرتا ہوں"۔

یہ کہہ کر وہ میرا جواب سُنے بغیر چل دیے۔ میں بھی حیران تھا کیونکہ میں قاضی صاحب کو برسوں سے جانتا تھا۔ وہ نیک اور صاف ستھرے آدمی ہیں۔ بدمعاملہ نہیں انھوں نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ——— لیکن نیّر صاحب کا معاملہ حساب کتاب کا تھا۔

معلوم ہوا کہ نیّر صاحب جامعہ سے شہر گئے اور وہاں سے سیدھے قاضی صاحب سے اپنی بات کہہ کر جامعہ واپس آ گئے۔ شام کو میں کیا دیکھتا ہوں کہ قاضی معزالدین احمد صاحب حساب کتاب کی بڑی بڑی جلدیں اپنے کارکن کے ساتھ لیے چلے آ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا ——— "احمد صاحب! یہ کیا لدے پھندے چلے آ رہے ہیں؟"

اُنھوں نے کہا ——— "اس وقت مصروف ہوں۔ ذرا نیّر صاحب کے پاس ایک کام سے آیا ہوں۔ پھر بات کروں گا"۔ میں سمجھ گیا کہ وہی حساب کتاب کا معاملہ ہوگا۔

پھر شاید قاضی صاحب کسی وقت چلے گئے۔ لیکن مغرب کی نماز کے بعد نیّر صاحب میرے پاس آئے اور بولے ——— "پرویز صاحب! میں بڑا شرمندہ ہوں۔ مجھ سے ایک غلطی ہوئی۔ قاضی معزالدین احمد مالک آزاد کتاب گھر، واقع کلاں محل دہلی۔ ——— جو میرے اور آپ کے مشترکہ دوست ہیں، ہرگز ہرگز بدمعاملہ

www.taemeernews.com

نہیں بلکہ بڑے صاف ستھرے انسان ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ ان کے ذمے میرے سولہ سو روپے نکلتے ہیں وہ دراصل میری حساب کی غلطی تھی۔ میں نے اپنی رائلٹی کا حساب نہیں لگایا تھا بلکہ کتابوں کی مجموعی قیمت کا حساب لگا لیا تھا اور اب جب کہ وہ تشریف لائے اور ہم لوگوں نے حساب کیا تو معلوم ہوا کہ میری کل رائلٹی مبلغ تین سو روپے بنتی ہے جس میں سے وہ مجھے ڈھائی سو روپے دے چکے ہیں۔ اور اب کل پچاس روپے بقایا ہیں۔ چنانچہ انھوں نے وہ پچاس روپے مجھے ادا کر دیے۔ میں نے رسید لکھ دی۔ حساب صاف ہو گیا۔ آج اس رقم سے میرا ایک ضروری کام ہو گیا۔

مجھے ہنسی آئی۔ میں نے کہا ——— "نیّر صاحب! میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ اس کساد بازاری کے زمانے میں جب آپ کو پتا چلا کہ کسی شخص پر آپ کے سولہ سو روپے واجب ہیں تو یہ بتائیے کہ آپ نے اپنے دل پر کیسے قابو پایا ——— خیر کبھی کبھی آدمی ایسے "شاک" خوشی خوشی برداشت کر لیتا ہے لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ سولہ سو روپے کے بجائے صرف پچاس روپے ملیں گے تو پھر آپ نے اس صدمے کو کیسے برداشت کیا؟"

نیّر صاحب نے بڑی سادہ لوحی سے جواب دیا ——— "دراصل سولہ سو روپے میرے کب تھے؟ وہ تو مجھ سے ایک حسابی غلطی ہوئی تھی۔ اسے غلط فہمی کہنا چاہیے اب پچاس روپے ملنے پر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیوں کہ یہ رقم میری اپنی ہے لیکن مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے تصدیق کر لینے سے پہلے آپ سے یہ بات کیوں کہہ دی۔ میں بے حد شرمندہ ہوں۔ میں نے قاضی معزالدین احمد صاحب سے معافی مانگ لی اور ان سے کہہ دیا کہ چونکہ میں نے پرویز صاحب سے اس کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے میں اُن سے اور معافی مانگ لوں گا۔ بہر حال میں شرمندہ ہوں کہ میں نے

www.taemeernews.com

ایک دیانت دار آدمی پر تہمت لگائی ۔ اللہ مجھے معاف کرے ۔ قاضی صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں ۔"

ہم میں سے کتنے ہیں جو آئے دن اپنے دوستوں اور عزیزوں پر تہمت لگاتے رہتے ہیں اور حقیقت حال سے آگاہ ہونے کے بعد ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوتے ۔ لیکن نیّر صاحب میں بچّوں کی سی معصومیت تھی اور اسی لیے ان کا ردِّ عمل بھی بڑا معصومانہ ہوتا تھا ۔ نیّر صاحب کے سینے میں بچّے کا دل تھا ۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے میرے بچّوں کے لیے ایک ڈرامے "گلیلی گلیلیو" کا پیش لفظ لکھتے ہوئے فرمایا تھا ——— بچّوں کے لیے لکھنے میں خود اپنے اندر سوئے ہوئے بچّے کو جگانا پڑتا ہے اور اسے اپنے آپ سے مانوس بھی کرنا پڑتا ہے ۔"

نیّر صاحب کے یہاں یہ بچّہ کبھی نہیں سویا ۔ انھوں نے اس بچّے سے صرف اپنی شاعری اور کہانیوں ہی میں کام نہیں لیا بلکہ زندگی بھر اس کے کہے پر عمل کیا ۔ اسی لیے کبھی کبھی ہمیں ان کی باتوں پر ہنسی بھی آتی تھی ۔ وہ بچّوں کی سی باتیں کرتے تھے ——— وہ بچّوں کی طرح خوش ہو جاتے تھے ——— ان کا ردِّ عمل فوری ہوتا تھا ۔ جو جی میں آتا تھا برملا کہتے تھے ۔ ان کی اپنی ذات میں کوئی ٹبراؤ حل نہیں ہوا اسی لیے ان کی شخصیت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا ۔ وہ موقع اور مصلحت کے قائل نہ تھے ہماری شخصیت دوہری ہو گئی ہے اور ہم اپنی دوہری شخصیت کے اس حد تک عادی ہو گئے ہیں کہ اکہری شخصیت کا آدمی ہمیں عجیب سا لگتا ہے ۔

ایک زمانے میں پروفیسر محمد مجیب سے وہ ناراض تھے اور بہت ناراض تھے کیوں کہ جامعہ میں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوا تھا ۔ لیکن جب پروفیسر مجیب نے انھیں جامعہ اردو کی رکنیت کے لیے جامعہ ملیہ کے نمایندے کے طور پر نامزد کیا تو وہ ہر ایک سے کہتے پھرتے تھے کہ مجیب صاحب نے ان کے ساتھ کوئی حق تلفی

www.taemeernews.com

نہیں کی۔ حالانکہ جامعہ اُردو کی رُکنیت اتنا بڑا اعزاز نہ تھا کہ مولوی محمد شفیع الدین نیّر کی سطح کا انسان اس سے مطمین ہوجاتا۔ ان کا دل صاف تھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے جامعہ اردو کے مسائل پر غور کرتے۔ کبھی کبھی مجھ سے آکر مشورہ کرتے اور ہر ہر پہلو سے اس اُردو ادارے کی بہتری کے بارے میں سوچتے۔ وہ جامعہ اُردو کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے اور جو لوگ اُردو سے دلچسپی رکھتے، ان سے تبادلۂ خیالات کرتے اور جلسوں میں مفید مشورے دیتے۔

بچپن کی غربت اور افلاس عام طور پر لوگوں کی شخصیت پر منفی اثرات چھوڑتی ہے۔ لیکن نیّر صاحب کی شخصیت بڑی پاک وصاف تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے زمزم سے دھودیا ہے۔ اس پر کوئی داغ دھبّا نہ تھا۔

محلّہ قانون گویاں، اترولی ضلع علی گڑھ کے ایک کمپونڈر بابو بلبیر سرن ان کے خاندان سے مانوس ہوگئے تھے۔ وہ کبھی کبھی شفیع الدین سے اپنے دلّی کے دوستوں کو خط لکھوایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کا بیٹا بیمار ہوا۔ وہ اسے ڈاکٹر مرزا کو دکھانے دہلی لے گئے تو شفیع الدین کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت اس بچّے کی عمر صرف بارہ برس کی تھی۔ ان کے والد نے ان کو دہلی جانے کی اجازت دے دی۔ نیّر صاحب اپنی والدہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میری والدہ کو علم کا شوق تھا۔ انھیں بہت دلچسپ کہانیاں اور کہاوتیں یاد تھیں۔ طبیعت میں خودداری حد درجہ کی تھی۔ کسی محنت و مشقت کو عار نہ سمجھتیں۔ چاہتی تھیں کہ میرے بچے لکھ پڑھ جائیں میری بڑی بہن محمود فاطمہ کی شادی ہوچکی تھی۔ میرے بڑے بھائی مرض صرع میں مبتلا تھے۔ لے دے کے ان کی ساری اُمیدیں میری ذات سے وابستہ تھیں۔ اس تعلیمی شوق ہی کی وجہ سے انھوں

www.taemeernews.com

نے مجھے دلّی آنے کی اجازت دی تھی۔ کتنا خوش نصیب تھا میں کہ مجھے ایسی وسیع النظر اور بلند خیال ماں کی گود نصیب ہوئی۔ ان کی ممتا اگر مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر مجبور کرتی تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔"

میرے دہلی آتے وقت میری والدہ کی حالت ایسی سقیم تھی کہ ریل کا کرایہ بھی مہیا نہ کر سکیں۔ بابو بلبیر سرن کو یہ بوجھ اٹھانا پڑا۔ کپڑوں کا ایک جوڑا اور کُل پانچ پیسے ——— دہلی آجانے پر میری کل کائنات بس یہ تھی۔"

بارہ سال کے بچے کی گھر سے دُور، ماں سے الگ پہلی عید کے موقعے پر شفیع الدین نے گھر خط لکھا تو اس میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

منانے ہیں خوشی، اب عید کی سارے جہاں والے
مبارک باد دیتے ہیں زمین و آسمان والے
وطن والوں کو جو ہیں بے وطن، ان کی خبر کیا ہے
خوشی کے دن بھی ہیں غمگین، ہم آہ و فغاں والے

دہلی میں شفیع الدین نے اخبار بیچنا شروع کر دیا۔ ان کا معمول تھا کہ وہ اخبار "ہمدرد" اور اخبار "رسالت" فروخت کرتے تھے۔ ان کے اخبار کے ایک خریدار شمس العلما مولانا سیّد احمد صاحب بخاری شاہی امام جامع مسجد دہلی تھے۔ انھوں نے ایک مرتبہ پوچھ لیا ——— "کیا تم پڑھنا چاہتے ہو؟" ——— اندھا کیا چاہے دو آنکھیں ——— انھیں تعلیم کا شوق تھا۔ دہلی میں دھوپ کڑی تھی۔ شفیع الدین نے جہاں۔ یہ دار پیڑ دیکھا، سستانے بیٹھ گئے۔ ان کا سستانا کیا تھا۔ پڑھنے لکھنے کے لیے کوئی سبیل نکالنا۔ دہلی میں چار پانچ مہینے انھوں نے اپنے ایک ہم وطن

www.taemeernews.com

اور ہم مدرسہ حافظ باقر علی صاحب کے یہاں گزارے۔ لیکن بارہ سال کے اس لڑکے کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ حافظ باقر علی کی مالی حالت ایسی نہ تھی کہ ان پر اور زیادہ بوجھ ڈالا جاتا۔ اس لیے شفیع الدین نے اپنا روزمرہ کا خرچ چلانے کے لیے اخبار فروشی کا پیشہ اختیار کیا ——— جس سے بہت بڑا سہارا ملا۔ لیکن جب امام صاحب نے پوچھا ——— "کیا تم پڑھنا چاہتے ہو"، تو شفیع الدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ——— نیّر صاحب تمام عمر ان کے اس سوال کے جواب میں شکرگزار رہے ——— نیّر صاحب شکرگزاری کے معاملے میں بڑے وسیع القلب تھے۔ اگر کوئی ان کے ساتھ نیکی کرتا تو وہ جگہ جگہ اس کی نیکی کا ذکر کرتے ——— اس لیے ان کے معاملے میں نیکی کر کے دریا میں ڈالنے والی بات بھی تھی۔ وہ دریا دل تھے۔ اس لیے ہر نیکی کو قبول کرتے اور دوسروں کو اس سے فیض یاب کرتے۔ ان کے یہاں نیکی برباد اور ضائع نہ ہوتی تھی۔ مجھ سے وہ یوسف دہلوی (مالک شمع، دہلی) کا ذکر بڑی محبت اور احسان مندی کے ساتھ کرتے۔ اس لیے کہ وہ نیّر صاحب کی نظموں کو اپنے رسالوں میں شائع کرتے اور ان کی کتابوں کا ایک مختصر اشتہار کبھی کبھی کھلونے میں شائع کرتے تھے۔ نیّر صاحب کو ان کی نظموں کا معاوضہ نہ ملتا تھا لیکن وہ اس اشتہار کے احسان کو کبھی نہ بھولتے، جس میں ان کو بچوں کا عظیم شاعر لکھا جاتا تھا۔ اسے وہ ایک سرٹیفکیٹ سمجھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف یوسف دہلوی کی تعریف کرتے تھے بلکہ ان کے بیٹوں کے بھی بڑے مداح تھے ——— احسان مندی کا یہ جذبہ ہم میں سے کتنوں میں ہوتا ہے۔ نیّر صاحب اپنے محسنوں کا نام برابر لیتے تھے۔ بابو بلبیر سرن، مولانا سید احمد صاحب بخاری۔ امام جامع مسجد اور دوسرے لوگوں کا ذکر اپنے ملنے والوں سے اکثر کیا کرتے تھے۔

ایک سال بعد ان کا داخلہ اینگلو عربک ہائی اسکول کی پرائمری شاخ چوڑی والان

www.taemeernews.com

کی پانچویں جماعت میں ہوگیا - گویا اب ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی - لیکن ذرا سوچو کہ جس کے گھر سے ایک پیسا نہ آرہا ہو، وہ اب باقاعدہ اسکول میں تعلیم پا رہا تھا - لیکن سچ تو یہ ہے کہ اگر کسی انسان کے دل میں یہ دُھن سما جائے تو پھر دروازے اپنے آپ کھلنے لگتے ہیں -

مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آیا - الہ آباد کے مشن اسکول میں، مَیں جب ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا - یہ بات ۱۹۳۷ء کی ہے - میرے ایک استاد تھے جناب نذیر احمد، وہ ہمیں حساب پڑھاتے تھے ——— میں حساب میں بے حد کمزور تھا - سُود + درسُود کے سوالات مجھ سے حل نہ ہوتے تھے - ایک روز نذیر صاحب مجھ پر بے حد ناراض ہوئے اور کہنے لگے ——— "آج سے میں تم سے بات نہ کروں گا" ——— ماسٹر نذیر احمد بڑے شفیق استاد تھے - اُن کے اس جُملے کا میرے اوپر بہت اثر ہوا - گویا اس نے تازیانے کا کام کیا ——— میں نے چکر ورتی حساب کی کتاب لی اور اسکول سے واپس آکر ان سوالات کو حل کرنے میں لگ گیا - جب بھی وقت ملتا، حساب کرتا ——— میں نے دس بارہ روز سخت محنت کی اور اب میں ہر سوال کر لیتا تھا - نوبت یہ آئی کہ نہ صرف یہ کہ سود درسود کے سوالات بڑی آسانی سے حل کرنے لگا بلکہ رقبے اور الجبرا کے اکویشن وغیرہ کے سوالات میں بھی مجھے کبھی کوئی دِقّت پیش نہ آتی ——— ماسٹر نذیر احمد صاحب نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی تھی - ایک روز میں ان کے پاس گیا ——— میں کہنا چاہتا تھا کہ اب میں سود درسود کے سوالات حل کر سکتا ہوں - لیکن لفظوں نے میرا ساتھ نہ دیا ——— اور میں رونے لگا - ماسٹر صاحب پر میرے رونے کا بڑا اثر ہوا - کہنے لگے ——— "تم پریشان مت ہو - میں تم کو خود پڑھاؤں گا ——— تم انشاءاللہ حساب کرنے لگو گے"

www.taemeernews.com

میں نے بچکیوں کے درمیان میں انھیں بتایا کہ "اب میں ہر سوال کر سکتا ہوں آپ میرا امتحان لے لیجیے اور مجھ سے بات کیجیے۔"

ہاں تو میں نیّر صاحب کے پڑھنے لکھنے کے شوق کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ ضلع میں مقابلے کے امتحان ہوتے تھے۔ ان مقابلوں میں اوّل آنے والے تین طالب علموں کو وظیفے ملتے تھے۔ شفیع الدین اس مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور ان کی پوزیشن بھی آگئی۔ بس پھر کیا تھا، باقاعدگی سے وظیفہ ملنے لگا۔ جامع مسجد کے شاہی امام صاحب نے مشورہ دیا ——— "تم یتیم خانے میں داخل ہو جاؤ۔ تاکہ تمھارے کھانے پینے اور رہنے کا مسئلہ حل ہو جائے۔"

شفیع الدین، امام صاحب کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے دل سے شکرگزار تھے۔ لیکن ان کو یہ تجویز پسند نہ آئی۔ شاید ان کی خودداری نے یتیم خانے کی زندگی کو قبول نہ کیا۔ انھیں یتیم خانوں کا حال معلوم تھا۔ ادھر عربک اسکول میں ان کے ایک استاد تھے ——— ماسٹر اصغر علی۔ انھوں نے ہونہار شاگرد کے لیے رہنما کا کام کیا ——— اور یتیم خانے کی اس تجویز کو رد کر دیا۔ ماسٹر اصغر علی نے انھیں کچھ دنوں اپنے ساتھ رکھا اور پھر مولوی فضل الدین صاحب ہیڈ ماسٹر نے انھیں ہوسٹل میں جگہ دے دی۔

اب ایسا لگا کہ جیسے طوفان کا ایک ریلا گزر گیا۔ انھیں سکون مل گیا۔ وہ ہر جماعت میں کامیاب ہوئے اور ہر بار جماعت میں اوّل آئے۔ اسکول میں ان کی قابلیت کی دھاک جم گئی۔ سچے روپے سالانہ وظیفہ ملتا تھا۔ کھانے پینے کا انتظام عربک ہائی اسکول میں تھا۔ اب وہ جی جان سے پڑھائی میں لگ گئے۔

جب شفیع الدین ساتویں جماعت میں تھے تو ان کی ملاقات اُردو کے ممتاز انشا پرداز خواجہ حسن نظامی سے ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنا اخبار

www.taemeernews.com

"رعیّت" نکالا تھا۔ اس کا دفتر اجمیری دروازے کے بازار میں گلی شاہ تارا کے سامنے تھا ——— نیّر صاحب اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے خود لکھتے ہیں:

"موصوف (خواجہ حسن نظامی) سے ملاقات ہوئی تو بڑی شفقت سے پیش آئے وہ عبارت بول بول کر مجھ سے مضامین لکھواتے اور کبھی کبھی تھوڑی بہت میری مدد بھی کر دیا کرتے تھے، گرمی کی بڑی چھٹیوں کا زمانہ، دو بار میں نے دفتر "رعیت" ہی میں گزارا۔ اِس قیام میں اخبارات پڑھنے کا خوب موقع ملا۔ اور میں دہلی کے ہر قسم کے سیاسی اور سماجی جلسوں میں شریک ہونے لگا۔ مجھے ملک کے حالات سے دلچسپی پیدا ہوئی اور مضمون نگاری کا شوق بڑھ گیا۔ اخبار "رعیت" ہی میں میرا اپنا لکھا ہوا پہلا مضمون "سدیشی پرچار" کے عنوان سے شائع ہوا۔ خواجہ صاحب نے اپنی اصلاح سے اسے اشاعت کے قابل بنا دیا تھا۔ کیا بتاؤں اس اشاعت سے مجھے کیسی خوشی ہوئی۔ اسی قیام کے زمانے میں خواجہ صاحب کی شبانہ روز محنت اور جفاکشی اور خوش معاملگی کا بھی اندازہ ہوا۔"

جس زمانے میں نیّر صاحب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ایم۔اے اُردو کا امتحان دے رہے تھے تو رات کو پابندی سے میرے پاس آیا کرتے تھے۔ میرے یہاں آکر بھی وہی نصابی گفتگو کرتے تھے۔ حالانکہ ان کا مطالعہ اچھا خاصا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلسل پڑھتے تھے۔ میں نے ایک روز کہا ——— "نیّر صاحب اِتنا زیادہ مت پڑھیے۔ آپ کا جو مطالعہ ہے وہ امتحان میں اوّل آنے کے لیے بہت کافی ہے۔ آپ اپنی صحت کا خیال رکھیے۔"

کہنے لگے ——— "پرویز صاحب! میں نے زندگی میں بڑی تکلیف اٹھائی ہے

www.taemeernews.com

جس فراغت سے اب پڑھ رہا ہوں - یہ فراغت مجھے زندگی بھر نصیب نہیں ہوئی - آپ خود سوچیے - اب میرے سامنے کھانے کا کوئی مسئلہ نہیں ہے - رہنے کے لیے اچھا خاصا مکان ہے - جو کتاب پڑھنا چاہتا ہوں بڑے اطمینان سے حاصل کر لیتا ہوں - اب مجھے کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے جو میرے پڑھنے لکھنے کے راستے میں حائل ہو ——— پھر بتائیے کیوں نہ پڑھوں"

میں لاجواب ہو گیا - اس زمانے میں نیّر صاحب میرے پاس سے اکثر کتابیں لے جاتے اور خود ہی پڑھ کر نہ صرف واپس کرتے بلکہ الماری میں اسی جگہ رکھتے، جہاں سے نکالی تھی - میں بہت بدسلیقہ ہوں - میری کتابیں ہمیشہ بکھری رہتی ہیں - جب کسی کتاب کی تلاش ہوتی ہے تو وہ کتاب عام طور پر نہیں ملتی - بعض اوقات اس کی تلاش میں کئی کئی دن ہو جاتے ہیں اور بالآخر مجھے وہ کتاب لائبریری سے لانا پڑتی ہے یا کسی دوست سے لے کر آتا ہوں - لیکن نیّر صاحب جب میری کتابوں کو دیکھتے تو انھیں کتابوں پر بھی ترس آتا اور میرے اوپر بھی — وہ مجھے کتابوں کے رکھنے کے طریقے بتاتے - میری میز پر کتابوں اور کاغذوں کا انبار رہتا تھا - نیّر صاحب نے میری میز کو درست کیا - کاغذوں کی بے ترتیبی پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا —

ایک بار ذاکر صاحب آئے - میں اس زمانے میں "پیام تعلیم" کا اڈیٹر تھا - یہ اطلاع ملی کہ ذاکر صاحب دفتر میں آ رہے ہیں - دفتر دیکھیں گے اور کارکنوں سے ملیں گے - میری میز پر حسب دستور کاغذوں کا انبار لگا ہوا تھا - میں بڑا پریشان ہوا - لیکن میں نے جلدی جلدی تمام کاغذات کو دراز میں رکھ دیا - ذرا سی دیر میں میری میز بڑی صاف ستھری ہو گئی - پیڈ اور پنسلوں کے علاوہ وہاں کچھ اور نہ تھا - ذاکر صاحب جب کمرے میں داخل ہوئے تو میری میز کی طرف غور سے

www.taemeernews.com

دیکھتے رہے۔ پھر بولے ——— "بھئی یہ ہے ایک اڈیٹر کی صاف ستھری میز ——— مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ آپ کے یہاں اتنی سلیقہ مندی ہے۔"

میں دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہا تھا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ذاکر صاحب نے باتیں کرتے کرتے میری دراز کھولی ——— دراز کیا تھی کاغذوں کا کباڑ خانہ تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں سربازار ننگا ہو گیا۔

ذاکر صاحب مسکرائے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کو حیرت نہیں ہوئی۔ کہنے لگے: "تو جناب یہ ہے آپ کی میز کی صفائی کا راز" ——— دو ایک مزے کی باتیں کر کے آگے بڑھ گئے ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی بے سلیقگی کو اچھی طرح سمجھنے کے باوجود میرے معمول میں فرق نہیں ہے۔ آج تک میرا یہی حال ہے نیّر صاحب نے کبھی اپنے انداز سے مجھے سمجھایا ——— بلکہ خود میری کتابوں کو ترتیب سے رکھا۔ لیکن کیا کیجیے بعض اوقات عادتیں بدل جاتی ہیں لیکن اس کے بل نہیں جاتے۔

نیّر صاحب چھوٹی چھوٹی باتوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ ایک مثالی استاد تھے۔ اپنے شاگردوں کے ساتھ ساتھ ان کی تربیت کا خاص طور پر خیال رکھتے تھے ان کے ایک شاگرد محمد صبیح عالم لکھتے ہیں: کہ ایک بار انھوں نے کہیں کہہ دیا۔ "آپ سمجھ نہیں سکے" یہ ایک طالب علمانہ غلطی تھی ——— نیّر صاحب نے انھیں بتایا کہ یہی بات دوسرے طریقے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔ مثلاً اپنے بڑوں سے بات کرتے ہوئے اس بات کو اس طرح کہنا چاہیے ——— "میں آپ کو سمجھا نہیں سکا۔"

نیّر صاحب جتنا اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھتے تھے اتنا ہی انھیں دوسروں کے بچوں کی فکر رہتی تھی۔ یوں بھی جامعہ میں تہذیب کی سطح اور جگہوں کے مقابلے میں خاصی ستر تھی۔ لیکن جامعہ میں بھی نیّر صاحب کے گھر میں تہذیب کی طرف خاص طور پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ نیّر صاحب کے بچے کبھی کسی سے اونچی

www.taemeernews.com

سے بات نہ کرتے تھے۔ ہر ایک سے آپ جناب سے بات کیا کرتے تھے۔ اسی لیے جامعہ میں لوگ کہا کرتے تھے کہ نیّر صاحب کے بچّے تو بچّے ـــــ کُتّے بلّی بھی مہذّب ہوتے ہیں۔

وہ جب ثانوی مدرسے سے گھر آتے تو اکثر بچّے ان کے ساتھ ساتھ ہوتے اور وہ ان سے باتیں کرتے آتے۔ اگر انسانی دماغ ڈبّے کی شکل میں ہوتا جس پر سر کا ڈھکن ڈھکا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ ایک دن نیّر صاحب اس ڈھکنے کو کھولے نظر آتے ـــــ اور اگر کوئی پوچھتا کہ "نیّر صاحب! کیا ہو رہا ہے"

تو نیّر صاحب برملا کہتے "ارے بھائی ـــــ آج میں نے شیخ سعدی کی تمام نصیحتوں کو اس لوٹے میں گھول لیا ہے اور میں اس بچّے کے دماغ میں اسے انڈیل رہا ہوں۔"

نیّر صاحب پانچ سال کی عمر سے ہی ماں باپ کی محبت سے محروم ہو گئے تھے۔ انھوں نے زندگی میں جو کچھ سیکھا اور جو کچھ حاصل کیا۔ وہ براہِ راست زندگی سے یا اپنے معلّموں سے۔ ماں باپ کی محبت جو تربیت کرتی ہے اس سے وہ بے خبر رہے۔ اس لیے وہ ہر بچّے کے معاملے میں دونوں فرائض پورے کرتے تھے۔ جب وہ اپنے طالب علموں سے پیار کرتے، ان سے باتیں کرتے اور ان کو درس دیتے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ نیّر صاحب یہ سمجھ رہے ہیں کہ یہ بچّے جو کچھ حاصل کریں گے مجھ سے ہی حاصل کریں گے ـــــ گویا اس بہانے وہ ان کے ماں باپ کے فرائض پورے کرتے ہیں۔

نیّر صاحب کو میں نے کبھی قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا، انھیں کبھی کوئی لطیفہ سناتے نہیں دیکھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ وہ کبھی کسی سے مذاق نہیں کرتے تھے البتہ ایک واقعہ ضرور بتانا چاہتا ہوں جس سے نیّر صاحب کے بھولے پن اور

64645

www.taemeernews.com

دوسروں کے مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔

ایک روز نیّر صاحب ایک بزرگ ادیب کے پاس پہنچے جن کی شہرت اور عزت قابلِ رشک تھی۔ ان کی خدمت میں نیّر صاحب نے اپنی نظموں کے مجموعہ کا مسودہ پیش کیا کہ "حضور! آپ اس پر ایک پیش لفظ لکھ دیں۔"

محترم ادیب نے کہا ——— "نیّر صاحب! شاید اس بات سے آپ واقف نہیں کہ میں عام طور پر کسی کی کتاب پر پیش لفظ یا تقریظ نہیں لکھتا۔ بس صرف اپنی کتابوں پر لکھتا ہوں اور اپنے سے متعلق لوگوں کی کتابوں پر ——— اس لیے مجھے اس خدمت سے معذور سمجھیں۔"

نیّر صاحب کو بظاہر اس انکار سے ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچی۔ وہ برجستہ بولے ——— "بہت اچھا کرتے ہیں حضور ——— ظاہر ہے کہ دوسروں کی تعریف کرنے سے بہتر ہے کہ انسان وہ الفاظ اپنے اوپر کیوں نہ خرچ کرے تاکہ اپنی ذات اور اپنوں کو ہی فائدہ پہنچے ——— یہ کہا اور نیّر صاحب ان کے پاس سے اُٹھ کر چلے آئے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ بزرگ اپنے لفظوں کے حصار میں نہ جانے کتنی دیر بیٹھے رہے ہوں گے اور نیّر صاحب کے الفاظ ان پر ہر طرف سے وار کر رہے ہوں گے۔

جہاں تک مجھے معلوم ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ طنز نیّر صاحب کی زندگی کا پہلا اور آخری طنز رہا ہوگا۔ کیونکہ اتنا پُر پیچ طور پر سوچنا نیّر صاحب کے مزاج سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا ——— انھوں نے تو جیسا محسوس کیا ویسا کہہ دیا۔ یہ واقعہ وہ مجھ سے اکثر بیان کرتے تھے اور مجھ سے پوچھا کرتے تھے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں کسی انسان کا درد نہ ہو، کیسے ادیب بن سکتے ہیں؟

نیّر صاحب کے یہاں بڑی معصومیت تھی۔ وہ معصومیت جو ایک بچّے میں ہوتی ہے۔ ان میں اور بچّے میں یہ فرق تھا کہ وہ احکامِ الٰہی کو اپنے اوپر فرض سمجھتے تھے

www.taemeernews.com

اور حتی المقدور ان سے عہدہ برآ ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نیّر صاحب بچوں کے بڑے ادیب بنے۔ ان کے ذہن میں اختراع کا غیر معمولی مادّہ تھا ——— وہ اچھا خاصا ذوقِ جمال بھی رکھتے تھے۔ لیکن وہ بڑوں کے ادیب نہ بن سکتے تھے۔ وہ افسانہ نگار اور ناول نگار نہیں بن سکتے تھے۔ کیونکہ نیّر صاحب بڑوں کے نفسیاتی پیچ وخم سے ناواقف تھے۔ انھیں اگر کسی سے شکایت ہوتی تو برملا اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ لفظ 'مصلحت' کے معنی ومفہوم سے قطعاً ناآشنا تھے۔

جب شفیع الدین اینگلو عربک اسکول میں پڑھتے تھے انھیں چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت میں اوّل آنے پر چھے روپے کا سرکاری وظیفہ ملا کرتا تھا تو مہاتما گاندھی کی آواز پر انھوں نے لبیک کہا اور عدمِ تعاون کی تحریک میں شامل ہو کر اسکول چھوڑ کر سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے کوئی راستہ نہ تھا کہ کدھر جائیں ——— انھیں تو ایسا لگا کہ جیسے کسی فرض نے ان کو پکارا ہو ——— کوہ ندا سے آواز آئی "یا اخی! یا اخی!" اور اس آواز کو سن کر شفیع الدین سب کچھ چھوڑ چھاڑ چل پڑے کہ کوہ ندا سے طلب آئی ہے کہ "شتابی آ" وہ یہ بھول گئے کہ انھوں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا اور وہ بھوکے ہیں۔ انھوں نے تو ہوسٹل کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اپنا بستر اور بکس اُٹھایا اور نکل آئے۔ بے سروسامانی ان کا انتظار کر رہی تھی اور وہ اس سے بغل گیر ہو گئے۔ سترہ سال کے اس لڑکے کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہ تھا۔ گاندھی جی نے ایسا کیمپ بھی کھولا تھا جہاں ایسے لوگوں کے قیام وطعام کا بندوبست ہو۔ انھوں نے اسے نیکی سمجھا اور فرض کے طور پر ادا کر دیا۔

شفیع الدین نے مہاتما گاندھی کی تحریک میں شامل ہونے کے بعد پھر آزاد قومی درس گاہ میں داخلہ لے لیا۔ نیّر صاحب کے ایک شاگرد تھے جسٹس قدیر الدین، جو اب پاکستان میں ہیں۔ یہ قومی درس گاہ قدیر الدین احمد صاحب کے ایک بڑے مکان

www.taemeernews.com

واقع کٹرا دینا بیگ خاں میں قائم کی گئی تھی۔ جسٹس قدیر الدین احمد لکھتے ہیں کہ ان کے بزرگوں نے اپنے گھر والوں کو اوپر کی منزل کے دو کمروں میں منتقل کر دیا تھا اور باقی سارا مکان "آزاد قومی درسگاہ" کو مفت دیا تھا۔ یہ جگہ وہی ہے جہاں آج کل ہمدرد دواخانے کا دفتر ہے۔ کچھ عرصے کے بعد یہ درسگاہ پریڈ گراونڈ کے سامنے کوچہ بلاقی بیگم میں منتقل کر دی گئی۔ چند سال تک تو یہ درس گاہ چلتی رہی، پھر بند ہو گئی۔ اس کے بانی اور روح رواں آصف علی بیرسٹر تھے۔

آزاد قومی درس گاہ کا الحاق جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تھا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بارے میں ذرا تھوڑی سی بات ہو جائے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے کچھ قوم پرست نوجوانوں کو یہ شکایت ہوئی کہ یہ ادارہ انگریز دوستی کا شکار ہو رہا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں نے تنگ آکر ایک ادارہ قائم کیا جس کی سرپرستی بزرگوں نے بھی کی اور اس کا قیام علی گڑھ ہی میں ہوا۔ ذاکر صاحب کے الفاظ میں اس کا حال سُنیئے:

"خدا کا شکر ہے کہ چند نوجوانوں کے اصرار پر قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے اس وقت جوش اور خلوص کو ایک پایدار کام میں لگانے کا فیصلہ کیا اور مجھے وہ وقت یاد ہے، اور میرے متعدد ساتھیوں کو بھی، جب علی گڑھ کالج کی مسجد میں ایک وجودِ مقدّس[1]، قید، جلاوطنی، علالت، اور تفکراتِ ملّی نے جس کی ہڈیاں پگھلا دی تھیں، جس کے چہرے کی زردی سے معلوم ہوتا تھا کہ غم کی آنچ نے، خون کا ایک اک قطرہ خشک کر دیا ہے، لیکن جس کی روشن آنکھیں اس یقین کی غمازی کر رہی تھیں کہ اگرچہ سب کچھ بگڑا دکھائی دیتا ہے لیکن مردوں کی طرح ہمت کی جائے تو مددِ خداوندی سے بہت کچھ بن سکتا ہے۔ یہ وجودِ مقدّس دیوار کا سہارا لیے بیٹھا ہے۔ ناتوانی کے باعث مجمع کو مخاطب بھی نہیں کر سکتا

---

[1] شیخ الہند مولانا محمود الحسن (اسیر مالٹا)

www.taemeernews.com

ہے اور اس کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانی سناتے ہیں:

صاحبو! یاد رہے کہ وہ جس دیوار کا سہارا لیے بیٹھے تھے وہ خالی اینٹ پتھر کی دیوار نہ تھی وہ ایمانِ محکم اور اس ایمان کے نتیجے یعنی ایک عظیم الشان ملّی ماضی کی دیوار تھی۔ وہ صرف ان نوجوانوں کو مخاطب نہ فرما رہے تھے جو ان کے سامنے تھے، ان کا روئے سخن قوم کی ساری آنے والی نسلوں کی طرف تھا۔ اس وقت کسی بڑے مکان کا سنگِ بنیاد نہیں رکھا گیا تھا، کسی عمارت کا افتتاح نہ ہو سکتا تھا۔ چندوں کا اعلان نہ ہوا تھا کہ یہ قافلہ سروسامان چھوڑ کر بے سروسامانی کی طرف رواں دواں ہو رہا تھا۔ یہ وقتی فائدے کے بدلے وقتی نقصان کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرہ زیادہ عزیز تھی اور محنت و مشقت کا عزم لے کر تعمیرِ نو کے لیے نکلا اور اس کی کلفتوں اور محنتوں کو دوسری سہولتوں اور تن آسانیوں سے زیادہ عزیز رکھنا چاہتا تھا۔ یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا تھا ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ کو۔

ہاں تو یہ ادارہ پہلے علی گڑھ میں قائم ہوا۔ پھر دہلی منتقل ہو گیا۔ مولانا محمود الحسن کے سلسلے میں مجھے ایک روایت ہمیشہ یاد آتی ہے۔ کہتے ہیں مولانا محمود الحسن مالٹا میں اسیر تھے۔ ان کے ساتھ ہی انگریزوں نے ان کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد مدنی کو بھی گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیا تھا۔ سردی کا زمانہ تھا۔ شیخ الہند صبح صبح جب نماز کے لیے اُٹھے اور انھوں نے وضو کیا تو پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ مولانا حسین احمد نے جب خود وضو کیا تو انھیں اندازہ ہوا کہ پانی کتنا

www.taemeernews.com

ٹھنڈا تھا۔ یقیناً ان کے استاد کو تکلیف پہنچی ہوگی۔ چنانچہ ان کا معمول تھا کہ وہ رات کو ڈبے میں پانی رکھ کر بستر پر لیٹ جاتے اور ڈبے کو سینے سے لگائے رکھتے صبح ہوتے ہوتے اس کی ٹھنڈ مر جاتی اور مولانا محمود الحسن صاحب وضو کرتے اور ان کو پتا بھی نہ چلتا کہ یہ پانی نیم گرم کس طرح ہوا۔ یہ عمل سارے جاڑوں جاری رہتا۔ اللہ اللہ کیسے لوگ تھے جو علم حاصل کرتے تھے تو اس کی قدر بھی کرتے تھے اور استاد کے لیے ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ہاں تو بات ہو رہی تھی آزاد قومی درس گاہ کی۔ شفیع الدین اس آزاد قومی درس گاہ کے ہونہار طالب علم تھے۔ بیرسٹر آصف علی نے درس گاہ کو مشہور کرنے کے لیے مہاتما گاندھی، حکیم اجمل خاں، اور ڈاکٹر انصاری کو ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء کو بطور مہمان بلایا۔ یہ لوگ ہمارے آپ کے لیے بڑے مقتدر تھے۔ لیکن حکومتِ وقت کے سامنے ان سب کی حیثیت باغی کی تھی۔ یہ لوگ ایک چھوٹے سے اسکول میں آئے تھے۔ یوں تو اسکول چھوٹا سا تھا لیکن اس کے پاس ایک بڑا آدرش تھا اور یہ اس آدرش کی کشش تھی کہ اتنے بڑے بڑے رہنما وہاں آئے ——— درس گاہ کی طرف سے جس طالب علم نے تقریر کی، وہ طالب علم شفیع الدین تھے۔ جسٹس قدیر الدین اور ان کے بھائی وہاں چوتھی جماعت میں داخل کر دیے گئے تھے۔

شفیع الدین نیّر نے کوئی کام کسی لالچ اور فائدے کی خاطر نہیں کیا ——— غالب نے کہا تھا کہ

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

غالب کو صحیح شکایت تھی کہ اللہ کی عبادت اور اطاعت بھی کچھ لوگ اس

MALIKRAM COLLECTION

www.taemeernews.com

لیے کرتے ہیں کہ جنّت ملنے کی اُمید ہے کہ وہاں شرابِ طہورہ اور دودھ اور شہد کی نہریں ہوں گی۔ مجھے اس وقت چارلس ڈارون یاد آرہے ہیں جنھوں نے انسانی ارتقا کا نظریہ پیش کرکے دنیا میں ہلچل مچادی۔ چارلس ڈارون نے اپنی سوانح حیات میں ایک صاحب کا ذکر کیا ہے۔ چارلس بابیج (Charlis Babbage) کا ——— چارلس بابیج بڑا دلچسپ آدمی تھا ایک ناراض انسان ——— اُسے دنیا کے لوگوں سے بڑی سخت شکایت تھی۔ پھر بھی اس کی باتیں سننے کے لائق تھیں۔ ایک روز بابیج نے کہا کہ اس نے ایک ایسا طریقہ دریافت کیا ہے جس سے کیسی ہی آگ فوراً بجھائی جاسکتی ہے۔ لیکن اس نے بہت زور دے کر کہا کہ "میں اپنے اس طریقے کو کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ جلنے دو، مرنے دو، ان کمبختوں کو۔"

ایک روز اس نے ایک واقعہ سنایا کہ اس نے اٹلی میں ایک جگہ پانی کا پمپ دیکھا جو بالکل سڑک کے کنارے لگا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی اس نے ایک بورڈ لگا رکھا تھا کہ یہ پانی کا نل رفاہِ عام اور کارِ خیر کے لیے لگایا ہے۔ اس سے انسانوں کو بھی فائدہ پہنچے گا اور خدا بھی خوش ہوگا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس راستے سے گزرنے والے پیاسے مسافر پانی پی سکیں۔ لیکن جب بابیج نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہاں نل کے پاس ایک نالی ہے جس کا ڈھال اس کارِ خیر کرنے والے کے گھر کی طرف ہے۔ ہر بار جب کوئی پیاسا راہگیر نل چلاتا ہے تو جتنا پانی وہ خود پیتا ہے اس سے زیادہ نالی سے مالک مکان کے گھر میں جاتا ہے۔ گویا مالک مکان کو نل چلانا نہیں پڑتا ——— اس طرح لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس نے کارِ خیر کیا ہے حالانکہ اس عمل میں اس کا اپنا بھی بھلا ہوتا ہے۔ آج ہم اپنے آس پاس ایسے کتنے آدمیوں کو دیکھتے ہیں جو نیک کام کرتے نہیں اور اگر کرتے بھی ہیں تو ان کے

www.taemeernews.com

اپنے فائدے کے ہوتے ہیں۔

ہاں تو شفیع الدین نیّر نے گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہا اور آزاد قومی درسگاہ میں آ گئے۔ یہاں میٹرک کا امتحان جامعہ جونیر کہلاتا تھا۔ اس کی نگرانی جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ کے سپرد تھی۔ شفیع الدین نے جامعہ جونیر کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ نیّر صاحب نے اپنے اس زمانے کے تجربات کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "۱۹۲۰ء میں بمقام ناگپور انڈین نیشنل کانگرس کا اجلاس ہوا۔ اسی زمانے میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس بھی ہو رہا تھا۔ اسکول کی طرف سے اس اجلاس میں شریک ہونے کے لیے دسویں کلاس کے طالب علم کیلاش ناتھ کول منتخب ہوئے اور نویں جماعت سے میں۔ ہم دونوں نمایندے اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس میں تو ہماری کچھ پذیرائی نہیں ہوئی۔ البتہ لالہ شنکر لال سکریٹری دہلی کانگرس کمیٹی نے ہم دونوں کو انڈین نیشنل کانگرس کا ڈیلی گیٹ بنا دیا۔ اس لیے ہمیں کانگرس کے جلسوں میں شریک ہونے، ملک کے بڑے بڑے رہنماؤں کی تقریریں سُننے اور وہاں کے ہنگامے دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ وہیں خلافت کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں، میں شریک ہوا۔ اس سفر میں کیلاش ناتھ کول کا برتاؤ میرے ساتھ بڑا ہی اچھا اور شریفانہ رہا۔"

اس زمانے میں شفیع الدین نے بڑے اچھے اچھے سماجی کام کیے۔ انھوں نے اسکول میں ایک لائبریری قائم کی۔ اس میں ہزار سے زیادہ کتابیں اکٹھا کر دیں — ۱۹۲۵ء میں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ علی گڑھ سے منتقل ہو کر دہلی آ گئی تو یہ لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے حوالے کر دی گئی۔ شفیع الدین نیّر نے گھر گھر جا کر آزادی کا پیغام پہنچایا۔

www.taemeernews.com

اور مئی جون کی تپتی ہوئی دھوپ اور لوؤں میں گانو گانو اور گھر گھر پھر کر لوگوں کو آزادی کی باتیں بتائیں۔

طالب علموں میں شوق پیدا کرنے کے لیے انھوں نے جمعیت اصلاح الطلبہ قائم کی۔ اس کا ایک دستور بنایا گیا۔ ہر ممبر کا فرض تھا کہ وہ ایک مثالی زندگی پیش کرے۔ اس انجمن میں تقریریں ہوتی تھیں اور سالانہ جلسے ہوتے تھے۔ جسٹس قدیر الدین کی والدہ نے ان کے لیے ایک شان دار گاؤن بنوایا جسے پہن کر وہ جلسوں کی صدارت کرتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ طالب علموں میں تقریر کا شوق پیدا ہو اور بے جھجک بول سکیں۔

"آزاد قومی درس گاہ" کے ہیڈ ماسٹر سید صغیر علی صاحب' ایک بار شفیع الدین کو اپنے ساتھ شاہدرہ لے گئے۔ وہاں شفیع الدین نے جلسوں میں خوب تقریریں کیں۔ اور شاہدرہ والوں نے انھیں اپنا نمایندہ چُنا اور دہلی کانگریس کمیٹی بھیجا۔ اس زمانے میں دہلی میں سوامی شردھانند' ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں کی دھوم تھی۔ ان جلسوں میں شفیع الدین بھی شریک ہوتے تھے۔ اب شفیع الدین "آزاد قومی درس گاہ" میں بے حد مقبول ہو گئے تھے۔ وہاں طالب علموں کی ایک انجمن تھی جس کا نام تھا "انجمن اتحاد"۔ شفیع الدین اس کے نائب صدر چُنے گئے۔ اس چناو کی خوبی یہ تھی کہ کوئی طالب علم بھی شفیع الدین کے مقابلے میں کھڑا نہیں ہوا۔ وہ اتفاق رائے سے نائب صدر چنے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ طالب علموں میں کتنے مقبول تھے۔ لیکن یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے' نیّر صاحب مزاجاً سیاست کے لیے پیدا نہیں ہوئے' سچائی اور دیانت داری ان کا وہ اصول تھا جنھیں وہ کسی قیمت پر ترک نہ کر سکتے تھے۔ وہ آزادی کی تحریک میں اس لیے شامل ہوتے تھے کیوں کہ وہ سچائی کا ساتھ دیتے تھے۔ اور آزادی کے بارے میں تلک نے اعلان کر دیا تھا کہ

www.taemeernews.com

"آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے"۔ اس سے پہلے فرانسیسی مفکر روسو نے کہا تھا کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ قید ہے"۔ ٹیپو نے کہا تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی، گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔

اس لیے انھوں نے آزادی کے جذبے کا ساتھ دیا ——— اپنے ضمیر کی آواز کا ساتھ دیا۔ لیکن ان کے مزاج کا معاملہ یہ تھا کہ وہ سیاست کے لیے سازگار نہ تھا۔ سیاست کے لیے کردار کا آڑا ترچھا ہونا ضروری ہے۔ نوجوان شفیع الدین نے تو گاندھی جی کو دیکھا تھا، حکیم اجمل خاں کو دیکھا تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور آصف علی بیرسٹر کی باتیں سنی تھیں۔ یہ نوجوان تو ہندوستان کے خوبصورت مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا اور جب یہ خواب چکنا چُور ہوئے تو اس نے کہا ——— "اپنے تجربے کی بنا پر میرے دل میں یہ بات جم گئی ہے کہ تعلیمی زمانے میں طالب علموں کو ہنگامی سیاست کے ہنگاموں میں شریک ہونے سے احتراز کرنا چاہیے"۔

لیکن وہ زمانہ تو اچھا تھا۔ لوگ خواب دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ شفیع الدین نے بھی خواب دیکھے اور علی گڑھ کی ٹرین میں سوار ہو گئے اور جامعہ ملیہ اسلامیہ پہنچے۔ شفیع الدین ۲ر جولائی ۱۹۲۲ء کو علی گڑھ پہنچے۔ علی گڑھ میں جامعہ کے ابتدائی کلاس میں ۱۹۲۲ء میں داخلہ لیا۔ یہ ڈاکٹر محمد عالم کا دور تھا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، سید نور اللہ، سید محمد، مولانا شرف الدین، مولانا عبدالحئی، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ اساتذہ میں شامل تھے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عبدالعلیم (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی)، حامد علی خاں (سابق مینجنگ ڈائرکٹر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر) اور کرشنا ناتھ ان کے ہم جماعت تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کالج میں داخلے کے لیے جامعہ نے رعایتیں دیں، لیکن جس کی جیب میں اپنے پیسے نہ ہوں، جس کے پاس کہیں سے منی آرڈر نہ آتا ہو، وہ کہیں بھی نہ پڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ تین مہینے کے

www.taemeernews.com

بعد پھر دہلی لوٹ آئے ۔ انھوں نے مدرسہ عالیہ فتح پوری میں داخلہ لے لیا ۔ یہاں وہ پڑھتے بھی تھے اور ٹیوشن کے ذریعہ اپنے روزمرّہ کا خرچ بھی چلاتے تھے ۔ اس زمانے میں مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" میں ایک مہینے کے لیے انگریزی سے اُردو ترجمہ کرنے کا کام مل گیا ۔ اسی ادارے میں مولانا عارف فتح پوری، سیّد محمد جعفری، اور ڈاکٹر سعید احمد بریلوی بھی شامل تھے ۔ کانگرس روزنامہ میں بھی انھیں انگریزی سے اُردو ترجمہ کرنے کا کام مل گیا ۔ ان کے ساتھ جو لڑکے پڑھتے تھے وہ عام لڑکے تھے جو کھانا اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ انھیں جینا ہے بلکہ اس لیے جیتے تھے کہ انھیں کھانا ہے، اس لیے ان کا قول تھا "پہلے طبق پھر سبق" ——— وہ کھانے پر علم کو ترجیح دیتے تھے ۔ اس لیے وہ اس مدرسہ عالیہ کی بھیڑ میں اکیلے ہی رہے ۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے فارسی منشی اور اردو ادیب عالم کے امتحان میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور پھر وہاں سے اس کی بدولت صرف انگریزی میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔

یہ زمانہ تھا جب ان کا ذریعہ معاش اخباروں میں عارضی طور پر کام کرنا تھا ۔ لیکن پھر اللہ نے سبیل نکال دی ۔ نواب بشیر الدین احمد کے دونوں پوتے جو آزاد قومی درس گاہ میں پڑھتے تھے ——— قدیر الدین احمد پاکستان بننے کے بعد وہاں چلے گئے اور چیف جسٹس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ حمید الدین احمد ریلوے بورڈ کے افسرِ اعلا کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ۔ دونوں حضرات آج بھی نیّر صاحب کے احسان مند ہیں ——— وہ نیّر صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں: "ان سے میرا اور میری بیوی بچّوں کا اب تک دِلی تعلق قائم ہے ۔ مُدّتوں بعد وہ ایک دفعہ پاکستان آئے اس زمانے میں میری بیوی کو فارسی پڑھنے کا شوق تھا ۔ چنانچہ نیّر صاحب نے ایک یا ڈیڑھ ماہ میں ان کو فارسی اتنی پڑھا دی کہ اس زمانے میں جو اُلجھن پیدا ہوئی تھی

www.taemeernews.com

وہ دور ہوگئی۔ ایک دفعہ اور تشریف لائے تو میری لڑکی کو اُردو پڑھائی۔ ان کا پڑھانا اس قسم کا تھا کہ شاگرد کو مضمون سے دلچسپی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ وہ بچّوں کو بھی پڑھا سکتے تھے اور بڑوں کو بھی ——— طالب علم پر بوجھ نہیں پڑتا تھا۔"

ہاں تو بات ہو رہی تھی قدیر الدین احمد اور حمید الدین احمد ——— دونوں بھائیوں کی ——— قدیر الدین احمد اور حمید الدین احمد ان کے شاگرد ہو گئے۔ اس کے بعد تو مالی پریشانیاں ختم سی ہوگئیں اور انھوں نے پنجاب یونی ورسٹی سے سکون کے ساتھ ادیب کامل کا امتحان پہلی پوزیشن سے پاس کیا اور انگریزی میں ۱۹۲۶ء میں انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔

اس زمانے میں شفیع الدین کو دہلی میونسپلٹی کے کٹرہ نیل کے پرائمری اسکول میں کام مل گیا۔ جب سالانہ معائنہ ہوا تو ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے دو استادوں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا۔ اس سے شفیع الدین کو بہت تکلیف پہنچی۔ انگریزوں کے زمانے میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولس کی رپورٹ بڑی اہمیت رکھتی تھی۔

مجھے اس وقت اپنا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ میں ناگپور کے انجمن ہائی اسکول میں بطور استاد کے پارٹ ٹائم کام کر رہا تھا۔ یہ زمانہ تھا کہ تمام اسکول استادوں سے خالی ہوگئے تھے۔ کیونکہ استاد اسکول چھوڑ چھوڑ کر سپلائی آفسوں میں چلے گئے تھے۔ علی گڑھ کے ایک استاد جناب محمد زبیر صاحب انجمن ہائی اسکول کے پرنسپل تھے ——— میں اس زمانے میں ناگپور میں تھا اور سیاسی تحریک سے وابستہ تھا۔ پرنسپل صاحب سے ملاقات ہوئی انھوں نے مجھے عارضی طور پر کام کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ چنانچہ میں پڑھانے لگا۔ جب سالانہ معائنے کے موقع پر انسپکٹر آف اسکولس آتے تو میرے پڑھانے سے مطمئن تھے۔

www.taemeernews.com

لیکن ان کو میرے لباس سے بہت شکایت تھی۔ میں اس زمانے میں کھدر کا کُرتا، پاجامہ اور کھدر کی بنڈی پہنا کرتا تھا۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر نے میرے بارے میں لکھا کہ جہاں تک پڑھانے کا تعلق ہے، قابلِ قبول ہوں۔ تاریخ اور سوکس کا اچھا استاد ہوں۔ کلاس کی ڈسپلن کے بارے میں لکھا کہ سب سے اچھی ہے لیکن لباس باغیانہ ہے اور حکومت کے نقطۂ نظر سے نامناسب ہے ——— چلتے ہوئے ہیڈ ماسٹر کو مشورہ دے گئے کہ دوسرے استاد کی تلاش جاری رکھیے اور مجھے جلد از جلد سبکدوش کرنا چاہیے۔ ان کی موجودگی طلبہ کے لیے مُضر ہے۔

ظاہر ہے کہ بیس سال پہلے بھی کم و بیش یہی رویہ رہا ہوگا۔ شفیع الدین نے اس ملازمت سے فوراً استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد انھیں عارضی طور پر اینگلو عربک اسکول میں ملازمت مل گئی۔ لیکن یہ ملازمت بھی چند روزہ تھی۔ شفیع الدین اس سے بھی جلدی ہی سبکدوش کر دیے گئے۔ ایک طرف علم کی لگن اور دوسری طرف روزی روٹی کی فکر ——— آدرش الگ کھال کی طرح بدن سے چپکے ہوئے تھے کہ ان کو لبادے کی طرح اُتارا نہ جاسکتا تھا۔ زندگی کے اس بازار میں ایسے انسان کی قیمت ہی کیا ———

ایک روز سننے میں آیا کہ ماڈرن اسکول میں ایک اردو فارسی کے استاد کی جگہ خالی ہے۔ نوجوان شفیع الدین نے سوچا کہ ان آدرشوں کا گزارا تعلیمی اداروں میں ہی ہوسکتا ہے چنانچہ وہاں درخواست دے دی ——— انٹرویو ہوا ——— دہلی یونی ورسٹی کے رجسٹرار مسٹر سین اور گورنمنٹ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر لالہ رتن لال نے انٹرویو لیا۔ ایک مہینے کے لیے اس شرط پر تقرر ہوا کہ چھٹی کی تنخواہ ملے گی اور نہ مستقل کرتے وقت اس مدت ملازمت کا حق مانا جائے گا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ مجبوراً یہ شرط قبول کرلی۔ لیکن انسان کی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی ——— سب

www.taemeernews.com

لوگوں پر اس نوجوان کی محنت اور قابلیت کا اثر ہوا۔ ایک مہینے کے بعد ہی اس جگہ پر تقرری کا پروانہ مل گیا۔ آزمایشی مدّت ایک سال سے گھٹا کر چھے مہینے کر دی گئی۔ اس زمانے میں ماڈرن اسکول، دہلی کا سب سے اچھا اسکول مانا جاتا تھا۔ تنخواہ بھی سرکاری اسکولوں سے کچھ زیادہ ملتی تھی۔ اب تو نوجوان شفیع الدین کو سہارا مل گیا ——— ایک اچھا ٹھکانہ مل گیا۔ گھنی چھانو مل گئی اور وہ وہیں بیٹھ گیا——— سستانے نہیں بلکہ کچھ کرنے کے لیے اس نے پڑھنا، پڑھانا اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس کو یہیں احساس ہوا کہ اُردو میں ننھّے مُنّے بچّوں کے لیے ایسی نظمیں نہیں ہیں جیسی انگریزی زبان میں ہیں۔ ماڈرن اسکول میں انگریزی کی ایک اُستانی تھیں مس ینگ ——— یہ چھوٹے بچّوں کو پڑھاتے وقت "نرسری رائمس" سے کام لیتی تھیں اور بچّے ان میں بڑا مزا لیتے تھے۔

شفیع الدین نیّر نے بھی ان کی دیکھا دیکھی بچّوں کے لیے اُردو میں ایسی نظمیں لکھیں جنھیں اُردو کے بچّوں کے رسالوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ گویا صحیح معنوں میں بچّوں کا شاعر بالاعلان ہمارے سامنے آگیا تھا۔ گھر گھر میں نیّر کی نظموں کی دھوم مچ گئی۔ ۱۹۳۴ء میں یہ نظمیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع ہوئیں "بچّوں کا تحفہ" چھپتے ہی ملک کے طول و عرض میں مقبول ہو گیا۔ اب تک غالباً اس مجموعے کی اشاعت ایک لاکھ کے اوپر پہنچ گئی ہوگی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین نے ان کے بارے میں لکھا اور صحیح لکھا:

"ان میں بچّوں کے ذہن کو سمجھنے اور ان سے محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدایشی معلّم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوقِ ادب اور ذوقِ جمال کی سمت بچّوں کی رہنمائی کے لیے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ ان میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بچّوں کے لیے جو نظمیں انھوں

www.taemeernews.com

نے لکھی ہیں، وہ ایک پیش رَو کی حیثیت سے ان کا نہایت ہی بیش قیمت کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے، جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔"

نیّر صاحب نے تقریباً ۱۹ سال ماڈرن اسکول میں کام کیا ——— انھیں جامعہ کے مقاصد اور اس کے طریقِ تعلیم سے ہمیشہ اتفاق رہا ——— وہ جامعہ سے بے پناہ محبت کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ماڈرن اسکول کے ل سے قدردان تھے۔ لیکن وہ ہمیشہ سچ کہتے تھے جو محسوس کرتے اس کا برملا اظہار کرتے تھے ——— اس لیے جامعہ کے اپنے تجربے، اس سے اپنی عقیدت کے باوصف جب ماڈرن اسکول کا ذکر کرتے ہیں تو بلا جھجک اور بلا تکلّف لکھتے ہیں:

"ماڈرن اسکول دولت مندوں کے لیے تھا۔ ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں میسّر تھیں۔ کام کی قدر کی جاتی تھی۔ وقت کی پابندی، اپنے فرض کو محنت سے انجام دینا، رات دن علمی مشاغل میں مصروف رہنا، اسی لیے ممکن تھا کہ تنخواہیں معقول تھیں اور یکسوئی سے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہا جا سکتا تھا۔ میں نے ہندوستان میں کئی پبلک اسکول دیکھے ہیں میری نظر میں تو اب تک ماڈرن اسکول سے بہتر کوئی اسکول نہیں جچا۔"

آج ماڈرن اسکول اپنے تعلیمی ریکارڈ پر فخر کر سکتا ہے۔ اپنے انتظامی امور پر اسے ناز ہو سکتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس ادارے کی عمارت میں اگر جان ہوتی تو وہ اپنا قد اور اونچا کر کے اعلان کرتا کہ میرے در و بام پر نیّر صاحب کی محبت بھری نظر پڑی ہے۔ میرے فرش پر نیّر صاحب کے شاگردوں کے قدم پڑے ہیں ——— اگر دیواریں آوازوں کو اپنی گرفت میں لے سکتیں تو یقیناً وہ نیّر صاحب کے درس کو

www.taemeernews.com

سفیدی کی طرح اپنے آپ سے چپٹا لیتیں۔ اور اسے اُکھڑنے اور ماند ہونے نہ دیتیں ـــــ اگر آوازیں فنا نہیں ہوتیں تو یقیناً وہ خاموشی سے ماڈرن اسکول کی عمارتوں کا طواف ضرور کرتی ہوں گی۔ کیا عجب کہ دل ہی دل میں ماڈرن اسکول بھی ان پر ناز کرتا ہو۔

سچ پوچھیے تو ماڈرن اسکول نے مولوی شفیع الدین کو نیّر بنایا۔ جس کی روشنی سے آنے والی نسلیں بھی فیض یاب ہوں گی۔ نیّر صاحب لکھتے ہیں:

"ماڈرن اسکول میں ۱۹۲۶ء سے ۱۹۴۵ء تک اٹھارہ سال سے بھی زیادہ مدّت تک کام کیا۔ اسی اسکول کی ملازمت کے زمانے میں میرے مضامین اور انگریزی سے اُردو میں ترجمے ملک کے مقتدر اخباروں اور رسالوں مثلاً کامیابی، نظام المشائخ، ارمغان تبلیغ نسواں، سعید، طبیب نسواں، ہمجولی دہلی، ہمایوں لاہور اور اخبار قوم دہلی میں چھپتے رہے۔ ۱۹۲۹ء میں رسالہ "کامیابی" دہلی نے اس عنوان پر کہ "انگریز حاکم اور ہم محکوم کیوں ہیں؟" مقابلے کے ایک مضمون کا اعلان کیا۔ میرا مضمون سب سے اچھا سمجھا گیا اور فیصلہ کرنے والی کمیٹی نے تیس روپے کا انعام مجھے عطا فرمایا۔ ماڈرن اسکول میں بڑے اچھے ساتھی ملے۔ جناب جیون ناتھ ڈر، جناب نند اپتی مکرجی، پنڈت دشرتھ اوجھا، رنگ بہادر ناتھ، اور مس ینگ صاحبہ۔ ماڈرن اسکول کی زندگی اور ساتھیوں کی ہمت افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے کام کی سمت مقرّر ہو گئی۔ میں اپنی زندگی میں بچّوں کے ادب اور زبان اُردو کی جو تھوڑی بہت خدمت کر سکا ہوں، تو میں اسی ادارے کی دین سمجھتا ہوں۔"

سردار خشونت سنگھ اڈیٹر "ہندوستان ٹائمز" ان کے مایہ ناز شاگرد رہے

www.taemeernews.com

ہیں۔ وہ اس زمانے میں ماڈرن اسکول میں پڑھتے تھے۔ وہ السٹریٹیڈ ویکلی میں لکھتے ہیں:

"جب کبھی میں کسی ناقابلِ فراموش شخصیت کا خاکہ ریڈرس ڈائجسٹ میں دیکھتا ہوں تو مجھے وہ مرد اور عورتیں یاد آتی ہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں ——— میرے بزرگ، رشتہ دار، ان کے رفقا اور کچھ مقدس ہستیاں ایسی تھیں جو صداقت، جرأت اور صبر و استقلال کی تعلیم دیتی تھیں ——— میرے کچھ دوست بھی تھے جن کا میں مداح تھا ——— ان سے بھی میرا جی ہٹ گیا صرف ایک شخصیت میری نگاہ میں باقی رہی ——— وہ جناب شفیع الدین نیّر کی ہے۔ بچوں کا تحفہ وغیرہ نامی کتاب ——— ان کی بے شمار منظوم کتابوں کے ذریعے اُردو بولنے والی تین نسلیں تو ان کے نام سے خوب واقف ہوں گی۔ مجھے بھی اس بات کا فخر حاصل ہے کہ میں ان کا پہلا اور چند برسوں تک واحد شاگرد ماڈرن اسکول میں رہا ہوں۔ چار سال کی مختصر مدت میں انھوں نے مجھے اردو گرامر اور ادب سے روشناس کرایا۔ مزید برآں مجھے اسلام سے بھی روشناس کرایا۔ میرے مذہبی تعصبات دُور کرائے۔ ان کی ذاتی شخصیت میرے لیے اس بات کی بھی رہنما ثابت ہوئی کہ پیسا پیدا کرنا ہی کوئی کام نہیں ہے بلکہ ضمیر کی راہ پر چلنا کام ہے اور یہ کہ ایک شخص اپنے ہم عصروں میں قابل احترام جبھی ہوتا ہے جب کہ وہ اصول شکنی سے انکار کرے۔ وہ ایک پختہ کار رقوم پرست ہیں۔ پیسے کو انھوں نے کوئی مقام نہیں بخشا۔ انھوں نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ حب الوطنی، سیاست دانوں ہی کا اجارہ نہیں ہے۔ اس لیے

www.taemeernews.com

میں اپنا ووٹ اس ناقابلِ فراموش کردار کو دیتا ہوں جس سے
میری ملاقات ہوئی اور وہ ہیں جناب مولوی شفیع الدین نیّر"

نیّر صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں، اتنے ہی اچھے معلّم بھی ہیں۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی دوربیں نظروں نے پہچان لیا ——— یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ ان کو جامعہ میں آنے کی دعوت دی۔ ذاکر صاحب، نیّر صاحب کے استاد بھی رہ چکے تھے۔ چنانچہ جب ذاکر صاحب نے انھیں جامعہ آنے کے لیے کہا تو وہ انکار نہ کر سکے اور کھنچے ہوئے چلے آئے۔ جامعہ میں تنخواہیں کم تھیں۔ پھر اس آدمی کے لیے جو اس سے دوگنی تنخواہ پا رہا ہو۔ لیکن نیّر صاحب کی روپے پیسے سے پہلے بھی کب دوستی تھی جو اب اس کا خیال رکھتے۔ جو نوجوان بغیر پیسے گزارا کرنے کا ہنر جانتا ہو، جس کو اپنے قوّتِ بازو اور علم و عقل پر بھروسا ہو، اس کو روپے پیسے کا کیوں خیال ہونے لگا۔ چنانچہ شفیع الدین نیّر نے ذاکر صاحب کی آواز پر لبیک کہا اور جامعہ کے اس کنبے میں داخل ہو گئے جہاں سب بے سروسامان تھے۔ لیکن محبت کی فراوانی تھی اور چند روز کے اندر اس کانِ نمک میں نمک ہو گئے۔

ماڈرن اسکول چھوڑنے سے وہاں سب کو تکلیف پہنچی، لیکن نیّر صاحب کو بھی تکلیف نہیں پہنچی۔ جب وہ ماڈرن اسکول کا ذکر کرتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ محض اسکول نہیں ہے بلکہ ایک ادارہ ہے، جس کے اپنے نصب العین ہیں۔ نیّر صاحب کہا کرتے تھے کہ یوں تو میں وہاں محض ایک معلّم تھا لیکن اس اسکول نے میری ذہنی تربیت میں بڑا حصّہ لیا۔ اسکول کے روحِ رواں لالہ رگھبیر سنگھ تھے۔ نیّر صاحب ان کا ذکر بڑے عقیدت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں وہاں مس بوم پرنسپل تھیں۔ ان کی انتظامی صلاحیت، استادوں سے ان کا برتاؤ، بچوں سے شفقت ——— یہ تمام باتیں ایسی تھیں جس سے اسکول کا وقار برابر بڑھتا رہتا

www.taemeernews.com

جب نیّر صاحب ماڈرن اسکول اور اس کے استادوں اور طالب علموں کو چھوڑ کر جامعہ آنے کا ذکر کرتے تھے تو مجھے غالبؔ کا مصرع یاد آتا تھا۔ ع

کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

نیّر صاحب نے ۱۳ر جنوری ۱۹۴۵ء سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مدرسہ ثانوی میں کام کرنا شروع کر دیا۔

نیّر صاحب جس محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتے تھے، یہ اُن ہی کا حصّہ تھا۔ وہ ایک مثالی استاد تھے۔ پہلے خود سبق تیار کرتے اور پھر جماعت کے سامنے درس دیتے۔ مجھے اس کا اندازہ اس بات سے تھا کہ میرے اور نیّر صاحب کے معاملات کچھ ایسے تھے کہ ہم بے تکلف ایک دوسرے سے مشورے کرتے تھے اور اپنے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ بعض اشعار کے سلسلے میں باتیں کرتے اور شعروں کی گتھیاں سلجھاتے۔ نیّر صاحب کی شاعری میں جو سادگی تھی اس سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا کہ وہ پیچیدہ اشعار کو سمجھنے اور سمجھانے میں کتنا لطف لیتے تھے۔ غالبؔ کے مشکل اشعار ان کے لیے خاص طور پر دلچسپی کا موضوع تھا۔ میرے عزیز دوست جناب مسعود الحق (لکچرر، استادوں کا مدرسہ۔ جامعہ ملیہ) ان کے پڑوسی تھے۔ وہ جب ایم۔ اے کا امتحان دے رہے تھے تو اکثر نیّر صاحب سے غالب کی غزلیں پڑھا کرتے تھے۔ وہ نیّر صاحب کی شعر فہمی کے بڑے قائل ہیں اور جب بھی ان کا ذکر آتا بڑے زوردار الفاظ میں تعریف کرتے۔

میں نیّر صاحب کو مثالی معلّم اس لیے کہتا ہوں کہ وہ طالب علم کو صرف جماعت میں ہی نہیں پڑھاتے، بلکہ جماعت کے باہر بھی ——— سڑک پر چلتے ہوئے ان کی حرکات و سکنات کا خیال رکھتے اور طالب علم کی ذرا سی گمراہی کو برداشت نہ کر سکتے تھے بلکہ اس کو بروقت ٹوک بھی دیتے تھے۔

نیّر صاحب وقت کے پابند تھے۔ اگر کسی شخص سے کسی کام کا وعدہ کرتے تو

www.taemeernews.com

حتّی الوسع اسے پورا کرتے۔ اسکول بھی وقت کی پابندی کے ساتھ جاتے۔ ایک بار صبح کا وقت تھا۔ میں ایک دوست سے باتیں کر رہا تھا۔ نیّر صاحب شیروانی پہنے تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے اسکول کی طرف جا رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ نیّر صاحب دَوڑ رہے ہیں۔ تاباں صاحب کی بڑی بیٹی عذرا اس وقت شاید چھٹی ساتویں میں پڑھتی تھی۔ وہ بھی دَوڑ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ نیّر صاحب اور عذرا کا دَوڑ کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ ہم دونوں بھونچکا رہ گئے کہ نیّر صاحب کو یہ کیا ہو گیا ہے لیکن نیّر صاحب وقت پر کلاس میں پہنچنا چاہتے تھے۔ اِس لیے دوڑ رہے تھے۔ اور یہ پہلی بار کی بات نہ تھی۔ جب کبھی انھیں دیر ہو جاتی وہ یہی کرتے ـــــ ایک دوست نے بتایا کہ ایک بار انھیں ایک جلسے کی صدارت کے لیے جانا تھا وہ گھر سے وقت پر نکلے۔ لیکن راستے میں کوئی صاحب مل گئے۔ نیّر صاحب کہتے رہ گئے کہ مجھے جلدی ہے لیکن انھوں نے چند منٹ ضائع ہی کر دیے۔ نیّر صاحب کچھ دُور یونہی چلے۔ اس کے بعد انھوں نے دَوڑنا شروع کر دیا۔ ہانپتے کانپتے جلسہ گاہ میں پہنچے ـــــ میزبان انتظار کر ہی رہے تھے۔ نیّر صاحب وقت پر پہنچ گئے تھے۔ لیکن سانس نہیں سما رہا تھا، دل دھڑک رہا تھا، لیکن وہ مطمئن تھا کہ وہ نیّر صاحب سے شرمندہ نہیں ہے۔

تعلیم و تربیت نیّر صاحب کی شخصیت کا بڑا ضروری حصّہ ہے۔ وہ جس بات کی تعلیم دیتے تھے، اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ ایک بار نیّر صاحب "ایک بہت بڑا" مسئلہ لے کر میرے یہاں آئے۔ کہنے لگے ـــــ "یوسف دہلوی میرے بڑے عزیز دوست ہیں ـــــ اور ساتھ ہی میرے کرم فرما بھی۔ میں ان کے رسالے کے لیے نظمیں لکھتا ہوں۔ اس کا معاوضہ تو نہیں دیتے۔ البتہ میری کتابوں کا اشتہار اپنے

www.taemeernews.com

بک ڈپو کی طرف سے شائع کرتے ہیں۔ اس اشتہار میں میری بڑی تعریف ہوتی ہے اس کے علاوہ ان کے ادارے سے جو رسائل شائع ہوتے ہیں وہ مجھے پابندی سے بھیجتے ہیں۔"

میں نے کہا ——— "یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن اس میں مسئلہ کی کون سی بات ہے؟"

کہنے لگے ——— "وہی تو بتانے جا رہا ہوں ——— آج میری بچی ایک رسالہ پڑھ رہی تھی۔ میں جو گھر میں داخل ہوا تو اس نے تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ جب وہ کسی کام سے باہر چلی گئی تو میں نے دیکھا کہ یہ "شمع" رسالہ تھا۔ اس میں فلمی ایکٹرسوں کی تصویریں تھیں اور ان کے بارے میں نازیبا باتیں تھیں ——— اب بتائیے میں کیا کروں؟"

میں نے کہا ——— "اگر آپ بچوں کے لیے مناسب نہیں سمجھتے تو خود اپنے پاس رکھ لیجیے۔"

نیّر صاحب نے حیرت سے کہا ——— "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جو چیز میں اپنے بچوں کو پڑھانا مناسب نہیں سمجھتا اسے خود کیسے پڑھوں؟"

میں نے کہا ——— "پھر کیا کیا جائے ——— کسی اور کو دے دیجیے۔"

نیّر صاحب بڑی بے بسی سے بولے ——— "آپ نہیں سمجھ سکتے ——— جو چیز میں اپنے بچوں کے لیے مناسب نہیں سمجھتا اسے دوسروں کو کیوں دوں؟"

میں نے کہا ——— "پھر تو اسے جلا دیجیے۔"

کہنے لگے ——— "جو تحفہ کسی نے محبت سے دیا ہو۔ اس کو جلانا کہاں تک مناسب ہے۔"

آخر میں نیّر صاحب نے خود کہا کہ وہ ایک خط یوسف دہلوی کو لکھیں گے کہ

www.taemeernews.com

آپ کا رسالہ 'شمع' برسوں سے میرے پاس آرہا ہے لیکن اب میرے بچّے بڑے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس کا میرے گھر میں آنا مناسب نہیں کیوں کہ ہم میں سے کوئی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا' اس لیے بہتر ہے کہ کسی اور کو بھیج دیجیے جو اسے شوق اور لطف سے پڑھے۔ البتہ اپنے دوسرے پرچے جاری رکھیے۔ میں ان کی جو خدمت کر سکتا ہوں کرتا رہوں گا۔"

اس واقعہ کے پیچھے کردار و عمل کی جو سچّائی ہے ——— جو سادگی و نیکی ہے ——— جو شرافت اور رواداری ہے ——— جو تہذیب و شائستگی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔

نیّر صاحب میرے یہاں بڑی بے تکلّفی سے آتے تھے' اُسی تیز رفتاری کے ساتھ چلے جاتے۔ ان کی باتوں کو سن کر یقین نہیں آتا کہ آج کا انسان ایسا بھی ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نیّر صاحب ایسے ہی تھے۔

ایک روز نیّر صاحب قاضی معز الدین احمد صاحب کے یہاں پہنچے۔ قاضی صاحب تنہا رہتے تھے۔ ان کے بھانجے خالد بھی ساتھ رہتے تھے۔ ہوٹل سے کھانا آتا تھا۔ تقریباً دو بجے کا وقت تھا۔ انھوں نے اس وقت تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ نیّر صاحب سے ان کے پرانے اور بے تکلّف تعلقات تھے۔ قاضی صاحب نے پوچھا ——— "نیّر صاحب! آپ ہمارے گھر کھانا کھالیں"۔

نیّر صاحب بولے ——— "جی نہیں آپ کھائیے ——— میں نہیں کھاؤں گا"۔

بار بار کے اصرار کے باوجود وہ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بالآخر خالد ہوٹل سے صرف دو کھانے لے کر آگئے اور دونوں آدمی کھانا کھانے بیٹھے۔ نیّر صاحب تھوڑی دیر تو چپ بیٹھے رہے پھر بولے: "یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ دو آدمی کھانا کھا رہے ہوں اور تیسرا آدمی بیٹھا دیکھ رہا ہو" ——— یہ کہا اور ہاتھ دھو کر کھانے کی میز پر آکر بیٹھ گئے اور کھانے میں شریک ہو گئے۔ خالد کسمسائے کیونکہ ان کے سامنے

www.taemeernews.com

یہ مسئلہ تھا کہ یا تو خود کھانے سے دست بردار ہوں یا ہوٹل سے جاکر دوبارہ کھانا لے کر آئیں ——— بالآخر مجبوراً ہوٹل سے کھانا لینے گئے۔

نیّر صاحب "پیام تعلیم" میں پابندی سے لکھتے۔ جب بھی میں ان کو رسالہ پیش کرتا اس کا ایک ایک لفظ پڑھتے اور اگلے روز مجھے اپنی رائے دیا کرتے۔ یہ رائے دینے وہ گھر آتے، بچّوں کے ادب کی کس مپرسی کے بارے میں باتیں کرتے، لیکن خود کبھی ہمت نہ ہارتے۔ نیّر صاحب کے اندر صلاحیت تھی کہ بڑوں کے لیے بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنی ساری صلاحیت کو بچّوں کے ادب کے لیے استعمال کیا۔ ایک بات یہ کہ ان کا غالبؔ کا مطالعہ بہت اچھا تھا۔ میں ان سے اکثر کہا کرتا تھا کہ آپ غالبؔ کے بارے میں بڑوں کے لیے کچھ لکھیں۔ جب میں مورشیس میں تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ نیّر صاحب نے غالب پر کوئی کتاب لکھی ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہوئی کہ نیّر صاحب نے بالآخر غالبؔ پر قلم اٹھایا۔ لیکن پھر مجھے معلوم ہوا کہ یہ کتاب بھی بچّوں کے لیے ہے۔ نیّر صاحب اس راز سے واقف تھے کہ ادب میں شہرت اور عزّت بڑوں کے ادب سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد ذرا ذائقہ بدلنے کے لیے بچّوں کے لیے بھی لکھنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر وہاں بھی بڑی آسانی سے جگہ مل جاتی ہے۔ لیکن نیّر صاحب نے کبھی شہرت اور عزّت کی پروا نہیں کی۔ انھوں نے بچّوں کے لیے اور صرف بچّوں کے لیے لکھا۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ بچّوں کے ادب کی تخلیق میں وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ یہاں ایک ایک لفظ پر محنت کرنی پڑتی ہے۔ لفظوں کی نشست و برخاست کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ لیکن بچّوں کے ادب کی کانفرنسیں نہیں ہوتیں۔ اس کے سیمنار نہیں ہوتے۔ اس میں صدر جمہوریہ، وزیر اعظم، اور دوسرے اکابرین سے ملنے کا موقع نہیں ملتا۔ بچّوں کی نظمیں اور کہانیاں سننے کے لیے جلسے نہیں ہوتے۔ لیکن نیّر صاحب نے ان کی پروا نہیں کی ——— وہاں سے

www.taemeernews.com

بے نیاز اپنی بچّوں کی دُنیا میں مست رہے۔

نیّر صاحب اپنے گھر میں بچّوں کے جلسے کرتے ——— جس میں ان کے اپنے بچّے ہوتے۔ پاس پڑوس کے بچّے ہوتے۔ اس میں بڑوں کو دعوت نہ دی جاتی۔ ہمارے پڑوسی عبدالدولی بخش قادری ان جلسوں کے گواہ تھے۔ ان جلسوں کا حال ان کی زبان سے سُنیے:

"ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ اس میں صاف ستھرا فرش بچھا ہوا ہے۔ ایک طرف بالکل بیچ میں ایک چھوٹی سی میز رکھی ہے اور ایک کُرسی۔ چند بچّے وہاں تمیز سے بالکل خاموش بیٹھے ہیں، جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔ اتنے میں ان کی امّی جان اور ابّا میاں کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ وہ بھی ان کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک بچّہ اپنی جگہ پر کھڑا ہوتا ہے اور سامنے دیکھتے ہوئے بالکل صاف لہجے میں کہتا ہے کہ میں آج کے جلسے کے لیے ابّا میاں کا نام پیش کرتا ہوں۔"

اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ایک بچّی کھڑی ہوتی ہے اور بڑے اطمینان سے اپنی دھیمی آواز میں کہتی ہے ——— "میں اس تجویز کی تائید کرتی ہوں" اور جھٹ سے اپنی جگہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ کمرے میں ایک آواز سی اٹھتی ہے کہ ہم سب تائید کرتے ہیں" ——— اور تالیاں بجتی ہیں۔ ابّا میاں اپنی جگہ سے اُٹھتے ہیں اور کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سب ان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ ایک خاص محبت کے انداز میں سب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ پچھلے جلسے کی باتیں کرتے ہیں اور اپنی نئی کہانی کا اعلان کرتے ہیں۔ ایک بار پھر اس چھوٹے سے کمرے میں تالیوں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

www.taemeernews.com

ایسے جلسے اس گھر میں عام طور پر ہر ہفتے ہوا کرتے ہیں۔ کبھی ابا میاں سے کہانی سننے کو ملتی ہے اور کبھی کوئی نظم۔ کہانی یا نظم سننے کے بعد ضروری ہوتا کہ بچے اس بارے میں اپنی رائے دیں۔ بہذا اپنی اپنی پسند اور سمجھ کے مطابق سب اپنی اپنی بات کہتے۔ اچھی خاصی بحث چھڑتی۔ لیکن ہمیشہ ہنسی خوشی کے ساتھ جلسہ ہوا کرتا۔ ان جلسوں میں بچوں کو بھی لطیفے سنانے، مضمون پڑھنے اور نظم خوانی کا موقع ملتا۔"

یہ بچوں کی ایسی انجمن تھی جس کا کبھی کوئی چناؤ نہیں ہوا، جس کو سرکار کے دفتر میں رجسٹرڈ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ اس انجمن کی روداد کبھی کسی اخبار یا رسالے میں نہیں چھپی تھی۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے کبھی کوئی بڑا آدمی نہیں آیا۔ اس نے کبھی سرکار سے کوئی امداد بھی طلب نہیں کی تھی۔ برسوں اس بے نام انجمن کے جلسے ہوتے رہے اور پھر بند ہو گئے۔ کیونکہ اس انجمن نے اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔ اس کا مقصد ان بچوں کو آج کی دنیا سے متعارف کرانا تھا۔ ادب اور تہذیب سکھانا تھا۔ جلسوں میں شرکت کے طور طریقوں سے آگاہ کرانا تھا۔ سو یہ کام ہو گیا اور شفیع الدین نیّر اپنے سفر میں آگے بڑھ گئے۔

جامعہ میں ہمارے ایک کرم فرما اخفر صاحب مرحوم تھے۔ یہ جامعہ میں خوش نویس تھے۔ یہ شاید ۱۹۵۴ء کی بات ہے کہ انھیں شمع معمّے کا بتیس ہزار روپے کا انعام ملا۔ وہ ہر ایک سے مشورہ کرتے رہتے تھے کہ اس رقم کو کس کام میں لگایا جائے۔ بالآخر انھوں نے اپنے گھر پر کپڑوں کی دکان کھول لی۔ دکان کیا تھی اندر کے ایک کمرے میں کپڑوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ جائیے اور اپنی پسند کا کپڑا نکال لیجیے۔ جامعہ میں اس وقت گنتی کے لوگ رہتے تھے اور سب ایک دوسرے کے دوست تھے۔

www.taemeernews.com

چنانچہ یہ دوست احباب جاتے، اگر انھیں چار گز کی ضرورت ہوتی تو اخضر صاحب بیس گز خرید واتے اور یہ کہتے کہ روپے کی فکر نہ کیجیے، جب ہوں گے تب دے دیجیے گا۔ جامعہ میں ضرورت مند کون نہ تھا۔ ہاں لیکن روپیا پیسا پاس نہ تھا۔ جیسے تیسے گزر بسر کرتے تھے۔ چند روز میں یہ عالم تھا کہ اخضر صاحب کے کاروبار کی بدولت گھر گھر میں رونق ہو گئی۔ سب لوگ خوش پوش نظر آنے لگے۔ عورتوں اور بچّوں کے ارمان پورے ہوتے۔ شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جو اخضر صاحب کے اس کاروبار سے فیض یاب نہ ہوا ہو۔ اخضر صاحب پان کھائے خوش خوش گھوما کرتے تھے کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ خوب فروخت ہو رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ نقد روپیا نظر نہیں آرہا ہے۔ لیکن کھاتے میں تو اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی ہے۔ سیکڑوں روپے ماہانہ کا منافع ہو رہا ہے اور کیا چاہیے۔

ایک روز نیّر صاحب میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے ——— "اخضر صاحب سے آپ کے بے تکلفانہ تعلقات ہیں۔ انھیں سمجھائیے کہ اس طرح روپیا ضائع نہ کریں۔ پھر یہ بھی کہ اس سے جامعہ کی معاشی زندگی پر بُرا اثر پڑے گا۔ پہلے لوگ جیسے تیسے گزر کر رہے تھے۔ چادر دیکھ کر اپنے پانو پھیلاتے تھے ——— پریشان تھے لیکن مقروض نہ تھے۔ اور اب ایک ایک کر کے سب مقروض ہوتے جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا ——— "نیّر صاحب چھوڑیے اخضر صاحب کو اُن کے حال پر۔ وہ اپنا بُرا بھلا خود سمجھ لیں گے۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔"

نیّر صاحب کو میری بات سے بڑی تکلیف ہوئی اور بولے ——— "ذرا اطمینان سے سوچیے گا۔ ان کا یہ عمل نہ ہمارے لیے (اہلِ جامعہ) مفید ہے اور نہ اخضر صاحب کے لیے ——— اور مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ اس سے ذاتی تعلقات پر بھی خراب اثر پڑے گا۔ اخضر صاحب بھی بہر حال بال بچے دار آدمی ہیں اور اب سُنا

www.taemeernews.com

ہے کہ انھوں نے خوش نویسی بھی چھوڑ دی ہے۔"

میں آج سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ نیّر صاحب نے اپنی فطری سادگی میں کتنی دور اندیشی کی بات کہی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد یہ ہوا کہ اختر صاحب کا روپیا بھی ختم ہو گیا اور کپڑوں کا کاروبار بھی ——— لیکن کھاتے میں اچھی خاصی رقم جمع تھی۔ لوگ اختر صاحب کو دُور سے آتا ہوا دیکھ کر راستہ کاٹتے تھے اور اختر صاحب کا عالم یہ تھا کہ مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو تقاضا کرنا تو دور کی بات ہے، خود شرمندہ ہوتے تھے اور بعض لوگوں کو دیکھ کر خود بھی کترا جاتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو انھیں کچھ یاد آ جائے، شاید حسابِ دوستاں اسی کو کہتے ہیں۔

نیّر صاحب نے اخیر وقت تک جامعہ ملیہ کی بے لوث خدمت کی۔ انھوں نے عبدالرزاق صاحب کے ساتھ بہار کا دَورہ کیا اور جامعہ کا کام چلانے کے لیے چندہ جمع کیا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جامعہ کو سخت نقصان پہنچا۔ کئی مہینے تک ادارہ بند رہا۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں پھر نیّر صاحب جامعہ کی سرگرمیوں میں شامل ہو گئے۔ انھوں نے پڑھنے پڑھانے کا کام شروع کر دیا۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کو ڈاکٹر ذاکر حسین کی ضرورت محسوس ہوئی اور وہ وائس چانسلر ہو کر علی گڑھ آ گئے۔ پروفیسر محمد مجیب قائم مقام شیخ الجامعہ ہوئے۔ جامعہ میں سرکاری امداد کے چرچے ہوئے۔ نئی نئی کرسیاں بنیں۔ بیٹھنے والوں کی تلاش ہوئی۔ پرانے لوگ، جو خدمت کے جذبے سے سرشار تھے اور انھوں نے فاقے کیے تھے، تکلیفیں اٹھائی تھیں۔ ان کے پاس بڑی بڑی سندیں نہ تھیں۔ یہ تو صرف خدمت کرنا جانتے تھے اور جب تک جامعہ کو خدمت کی ضرورت تھی انھوں نے بے لوث خدمت کی۔ یہ لوگ روپے اور منصب سے میلوں اور کوسوں دُور تھے۔ یہ لوگ ڈگریوں کو اہمیت نہ دیتے تھے، اکثر و بیشتر مشرقی علوم کے ماہر تھے۔ انھیں انگریزی زبان سے زیادہ

www.taemeernews.com

دلچسپی نہ تھی۔ معمولی پہنتے، سادہ زندگی گزارتے۔ مطبخ سے کھانا آتا جسے ہنسی خوشی کھاتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے۔ اس زمانے میں کبھی کسی آدمی کو مطبخ کے کھانے کی شکایت کرتے یا اس کا مذاق اڑاتے نہ دیکھا۔ سستا کھانا کھاتے اور مِل جُل کر رہتے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے، ان کے سُکھ دُکھ میں شریک ہوتے اور مطمئن تھے۔ تھوڑے سے آدمی تھے لیکن خوب تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ سب ہی ایک طرح سوچتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ دوستوں کے اپنے اپنے حلقے بھی تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین بھی تھی جس کے جلسوں میں غیر ترقی پسند بھی شریک ہوتے تھے۔ کسی کو کسی سے ایسی شکایت نہ تھی کہ ملنا جلنا ترک کر دیں۔ البتہ بڑے چھوٹے کا فرق نہ تھا۔ سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے تھے۔ جو کچھ ملتا اس پر صبر و شکر کرتے۔ جامعہ کے آس پاس کے رہنے والے خصوصاً اوکھلا گانو کے لوگ بھی جن سے ہم لوگوں کا صبح شام کا واسطہ تھا، وہ بھی درویشوں کی اس بستی سے خوب اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ مجھے اس پر ایک واقعہ یاد آیا:

اوکھلا گانو میں ایک دھوبی چندی ہمارے کپڑے دھوتا تھا۔ ایک روز صبح صبح آیا۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے۔ اس نے باہر سے ہی کھڑے کھڑے پوچھا ——
"آپا! کیا ماسٹر صاحب کی تنخواہ مل گئی؟" (ہم سب وہاں ماسٹر صاحب کہلاتے تھے)
میں نے جواب دیا —— "ابھی نہیں ——"

میں نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی اور کچھ کہنا چاہتا تھا کہ چندی نے کسی کو ڈانٹنا شروع کر دیا —— "ہم نہیں کہتے تھے کہ ابھی تنخواہ نہیں ملی۔ یقین ہی نہیں آتا —— ہم خود دے دیں گے جب تنخواہ ملے گی" —— دوسرا آدمی جو اس کے ساتھ آیا تھا معافی مانگ رہا تھا اور چندی تھے کہ ڈانٹے جا رہے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ بھی کسی اور کے مقروض تھے، اور تصدیق کے لیے اس کو لائے تھے۔ یہ لوگ بھی جامعہ

www.taemeernews.com

کے کارکنوں کی عزّت کرتے تھے اور محبت بھی ——— آج بھی جب میں جامعہ جاتا ہوں تو چندی سے ملاقات ہوتی ہے اور چندی کو بھی یہی شکایت ہے کہ ماسٹر صاحب اب لوگوں کے پاس پیسا تو آگیا ہے۔ بڑے بڑے انگریزی بولنے والے آگئے ہیں ——— سب نے اپنے اپنے مکان بنا لیے ہیں ——— ایک ایک گھر میں کئی کئی کمانے والے بھی ہو گئے ہیں ——— لیکن سچ بات یہ ہے کہ وہ پہلی سی بات نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ماسٹر رشید نعمانی جیسے لوگ اب بھی ہیں ——— لیکن یہ لوگ بھی کتنے دن ———؟

میں بھی سوچتا ہوں کہ چندی کی بات میں کتنی بڑی سچائی چھپی ہوئی ہے۔ اب بھی چندی میرے کپڑے میری عدم موجودگی میں رشید صاحب کے یہاں سے لے جاتا ہے اور انھیں دھو دھا کر استری کر کے ٹانگ جاتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اس بہانے وہ پرانی جامعہ سے رشتہ قائم کر رہا ہے جو روپے پیسے سے بالاتر تھی۔

جامعہ کی زندگی بڑی عجیب و غریب تھی۔ ہر ایک اپنی کھال میں مست تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کوئی الگ تھلگ دُنیا تھی۔ ہماری آج کی دنیا سے بالکل مختلف۔ ایک اچھی اسلامی زندگی ——— لیکن نہ جانے کس کی نظر لگ گئی۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ خوبصورت چہرے پر بدصورتی کا ایک داغ لگا دینا چاہیے کہ کسی کی نظر نہ لگے۔ چاند پر بھی اللہ تعالیٰ نے یہ داغ لگا دیا ہے ——— لیکن جامعہ بے داغ تھی اور اس کو نظر لگ گئی، کوئی بچا نہ سکا۔ مجیب صاحب آج بھی کبھی کبھی چلتے پھرتے نظر آجاتے ہیں لیکن وہ اپنی یادداشت کھو چکے ہیں۔ افسوس ہوتا ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ کرسیاں آنے لگیں ——— کرسیوں کے ساتھ ان پر بیٹھنے والے بھی باہر سے آنے لگے۔ پرانے لوگ جنھوں نے جامعہ سے پیمانِ وفا باندھا تھا، یا تو بزم سے اُٹھ گئے، یا ریٹائر ہو گئے ——— جو ابھی اپنے اپنے کام میں

www.taemeernews.com

لگے ہوئے تھے، نئے آنے والے اسکالرز کا خیر مقدم کرنے کے لیے گلدستہ ہاتھ میں لیے ہوئے کھڑے ہوگئے۔ مولوی محمد شفیع الدین نیّر اب عمر کی اس منزل میں تھے جہاں ان کے اپنے بچے اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انھیں بھی قدموں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیونکہ ان کے پاس یونی ورسٹی کی کوئی بڑی ڈگری نہ تھی۔ لے دے کر اُردو اور فارسی کے کچھ سرٹیفکیٹ تھے یا انٹرمیڈیٹ تک کی انگریزی تعلیم ——— انھوں نے آنے والے دنوں کا اندازہ لگایا اور پنجاب یونی ورسٹی سولن سے بی۔ اے کا امتحان دیا۔ یہ ۱۹۵۱ء کی بات ہے۔ اللہ نے اس کا اَجر دیا۔ کامیاب ہوئے۔ فارسی اور تاریخ میں بڑے اچھے نمبر آئے۔

اس کے بعد شفیع الدین نیّر کو فکر ہوئی کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں ایم۔ اے کا امتحان بھی دے ڈالا جائے۔ اپنے اوپر اعتماد تھا۔ مجیب صاحب کشمیر گئے ہوئے تھے اگلا امتحان دینے کے لیے قاعدے کے مطابق اجازت کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اجازت کے لیے مجیب صاحب کو لکھا۔ مجیب صاحب نے مندرجہ ذیل جواب دیا:

برادرم نیّر صاحب، السلام علیکم

آپ کا محبت نامہ پرسوں ملا۔ آپ کی کامیابی کی خبر سُن کر انتہائی مسرّت ہوئی۔ لیکن آپ کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ آپ کو نمایاں کامیابی حاصل ہوگی۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی محنت بار آور ہوئی اور میرا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔ شاید آپ جانتے ہوں گے کہ میں کسی کی بے حد تعریف نہیں کرتا۔ مگر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میری اس عادت کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہو۔ مجھے جب کبھی خیال ہوتا ہے کہ جامعہ کے تعلیمی کاموں میں باقاعدگی اور استقلال نہیں ہے تو آپ کے طریقِ کار کو اور اس اعتبار کو جو اس نے آپ کے

www.taemeernews.com

تمام ساتھیوں میں پیدا کیا ہے، یاد کرتا ہوں اور دل کو سہارا ہو جاتا ہے۔ میں ہندوستان کی کسی یونی ورسٹی کو اس قابل نہیں سمجھتا جو آپ کا امتحان لے سکے، مگر یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔

اگلے سشن میں چاہتا ہوں کہ زیادہ وقت مدرسہ ثانوی میں صرف کروں اور آپ نے جو طریقہ اوّل اور دوم کے نصاب کو پڑھانے کا جاری کیا ہے، وہ اور مضمونوں میں بھی جاری کراؤں۔ اس لیے میرے خیال میں بہتر ہوگا کہ آپ ایم۔اے اردو میں کریں تاکہ مجھے آپ سے مشورہ کرنے میں تامل نہ ہو۔ آپ کو بہت دنوں سے چھٹی لینے اور آرام کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، مگر اس کے لیے میں کوئی اور بہتر شکل سوچ رہا ہوں۔

آپ کا مخلص
محمد مجیب

مولوی محمد شفیع الدین نیّر نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے ۱۹۵۴ء میں ایم۔اے اردو کا امتحان دیا اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کی سفارش پر اربابِ جامعہ نے انھیں مدرسہ ثانوی سے کالج میں بحیثیت لکچرر منتقل کر دیا۔ یہاں انھوں نے بڑی محنت سے پڑھایا۔ طالب علموں میں ان کی مقبولیت بڑھتی چلی گئی۔ جہاں انھوں نے بارہ سال تک خدمت کی اور ۱۹۶۹ء میں ریٹائر ہوئے۔

جامعہ میں نیّر صاحب کی سبکدوشی پر رسمی جلسے ہوئے جن میں شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب، پرنسپل ضیاء الحسن فاروقی اور عبدالمدولی بخش قادری نے بڑی موثر تقریریں کیں اور ان کی ادبی اور تعلیمی خدمات کو جی بھر کر سراہا۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی یونی ورسٹی) بتاتے ہیں کہ وہ سکنڈری اسکول کی

www.taemeernews.com

نصابی کمیٹی کے رکن تھے ۔ انھوں نے نیرّ صاحب کی کتاب ”غالب کی کہانی“ کی بورڈ کے نصاب کے لیے سفارش کی اور یہ کتاب نصاب میں شامل کر لی گئی ـــ نیرّ صاحب بے حد خوش ہوتے اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کی کوشش سے یہ کتاب داخل نصاب ہوئی تو ان کا شکریہ ادا کرنے تیمار پور گئے جامعہ نگر سے تیمار پور کا فاصلہ بیس پچیس میل ہے ۔ ظہیر صاحب شرمندہ تھے کہ انھیں اتنی زحمت ہوئی ۔ انھوں نے کہا ـــــ ”آپ بلا وجہ ممنون ہیں اس کے لیے تو ہم لوگوں کو آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ نے ایک ایسی کتاب لکھ دی جس سے بچّے غالبؔ سے اچھی طرح واقف ہوسکیں“ لیکن نیرّ صاحب نے اس کے بعد بھی ہر جگہ ظہیر صاحب کی تعریف کی اور اپنی احسان مندی کا اظہار کیا۔

ایک بار جامعہ اردو کا ایک جلسہ بمبئی میں ہوا ۔ شفیع الدین نیرّ صاحب جامعہ کے رکن تھے ۔ اس حیثیت سے انھوں نے جلسے میں شرکت کی ۔ بمبئی میں نیرّ صاحب کے قدر دانوں کی کمی نہ تھی ۔ انھوں نے نیرّ صاحب کے اعزاز میں جلسہ کیا ۔ جلسے میں نیرّ صاحب کے کارناموں کا ذکر آیا ۔ کئی ادیبوں نے تقریریں کیں اور جلسے کے بعد ان کو تحفے کے طور پر ایک وی ۔ آئی ۔ پی کا بریف کیس پیش کیا ۔ نیرّ صاحب پر اس تحفے کا غیر معمولی اثر پڑا اور انھوں نے بڑی مسرّت کے ساتھ ہر ایک کو اپنا تحفہ دکھایا ۔ وہ اس کو پاکر اس قدر خوش ہوتے جیسے کوئی بچّہ عیدی پاکر خوش ہوتا ہے ۔

نیرّ صاحب کو جب کبھی کوئی منصب ملا ۔ انھوں نے اس کی ذمہ داری کو سمجھا اور برتا ۔ جب وہ جامعہ اردو کے رکن نامزد ہوتے تو بے حد خوش ہوتے اور انھوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ اس منصب کو نباہا ۔ کتنے لوگ ہیں جو اپنی منصبی ذمہ داری کو سمجھتے اور اس کو فرض کے طور پر ادا کرتے ہیں ۔

www.taemeernews.com

جامعہ ملیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد نیّر صاحب نے بچوں کے ادب کی تخلیق کی طرف خاطرخواہ توجہ دی۔ ملازمت کی ذمہ داریوں اور مصروفیتوں کی بنا پر جو کام نہ کر سکے، اسے پورا کرنے میں لگ گئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے ذاکر صاحب کی فرمایش پر "غالب کی کہانی" لکھی۔ پھر ان کی فرمایش پر "دلّی کے نئے ادیب و شاعر" کے موضوع پر بڑا کام کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ان کا پروگرام تو یہ تھا کہ وہ دہلی کے پچیس ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں لکھیں لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ چودہ اصحاب پر مقالے لکھ لیے جن میں سے بعض ادبی رسائل میں چھپ بھی چکے ہیں۔ ان کی صحت خراب ہو گئی تھی لیکن کام کرنے سے کبھی پیچھے نہ ہٹے۔

علی گڑھ اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے اور جب آتے پابندی سے ملتے اور میرے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ وہ ڈاکٹر محمد عزیر صاحب (ریڈر شعبہ اُردو) کے ساتھ قیام فرماتے۔ کہتے تھے کہ ان سے دیرینہ مراسم ہیں اس لیے برابر ان کے ساتھ ٹھہرتے۔ جب عزیر صاحب پاکستان چلے گئے تو جناب رحم علی الہاشمی کے صاحبزادے ڈاکٹر حمید الہاشمی (پرنسپل پالی ٹکنیک) کے ساتھ ٹھہرتے۔ البتہ جب یہ اصحاب علی گڑھ میں نہ ہوتے تو مجھے خدمت کرنے کا موقع دیتے۔ ان کی محبت، ان کا خلوص، ان کی دردمندی ——— میں ہمیشہ ان سے فیض یاب ہوتا رہا۔

میں مورشیس میں تھا کہ اچانک جناب رشید نعمانی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ مولوی محمد شفیع الدین نیّر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ یہ سانحہ ۳۰ جنوری ۱۹۷۸ء کی رات کو پیش آیا۔ جب سارے ملک نے مہاتما گاندھی کی شہادت کا سوگ منایا اور ان کی یاد میں جلسے کیے تھے۔ اب اُردو والوں کے لیے ایک اور چراغ بجھا تھا اور ان کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔

www.taemeernews.com

اس روز کا حال ڈاکٹر شمیم حنفی نے یوں لکھا ہے :

" شام ہو چکی تھی۔ میں ایک دوست کے گھر جانے کے لیے بچّوں کے ساتھ باہر نکلا۔ اچانک نیّر صاحب نظر آ گئے۔ ہمیں دیکھا تو رُکے۔ ایک اک کر کے سب کی خیریت پوچھی۔ رخصت ہونے سے پہلے بولے ——— "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے گا۔"

میں نے کہا ——— "آپ کی محبت ہمارے لیے بڑی دولت ہے۔"

بڑی سادگی سے ہم سب پر نظر ڈالی اور چلتے چلتے فرمایا ———

"آپ یہاں نئے ہیں۔ میں بہت دنوں سے رہ رہا ہوں ——— اس لیے ———"

میں نے شکریہ ادا کیا۔ پھر ہم سب نے آداب کیا ــ خلاف معمول نیّر صاحب نے دو تین بار پیچھے مُڑ کر اور رُک کر ہماری طرف دیکھا ——— پھر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

اس سے پہلے کا اُسی روز کا حال جناب ولی شاہجہانپوری اڈیٹر "پیام تعلیم" لکھتے ہیں :

"وہم و گمان بھی نہ تھا کہ نیّر صاحب اتنی جلد داغِ مفارقت دے جائیں گے۔ ۳۰ر جنوری ہی کی بات ہے مرحوم تقریباً دس بجے دفتر میں تشریف لائے۔ حسب عادت فرداً فرداً سب سے ملے۔ شاہد علی خاں جنرل منیجر پریس جا چکے تھے۔ ان سے ملنے برٹی آرٹ پریس گئے۔ شاہد صاحب سے کام یہ تھا کہ ایک لڑکی کی کتابت کا نمونہ دکھا کر چاہتے تھے کہ اُسے کتابت کا کچھ کام دیا جائے۔ شاہد صاحب کے کہنے پر کہ اتنے سے کام کے

www.taemeernews.com

لیے اتنی دُور آنے کی زحمت کیوں اُٹھائی۔ فرمایا ——— "میں اس لڑکی سے کہہ آیا تھا کہ نمونۂ کتابت شاہد صاحب ہی کے ہاتھ میں دوں گا۔"

"اللہ اللہ! زبان کا اتنا پاس کہاں ہے آج کل کے لوگوں میں۔ یہ تھی نیّر صاحب کی ہمدردی اور انسان دوستی۔ پریس سے اُٹھ کر نیّر صاحب جامع مسجد پر ہماری برانچ پر گئے۔ پھر کئی احباب سے ملاقات میں تمام دن گزارا ——— رات میں ساڑھے آٹھ بجے میرے مکان کے قریب مجھ سے ملاقات ہوئی۔ عرض کیا ——— "اس سردی میں کہاں جا رہے ہیں؟"

بولے: "اپنی نواسی کو دیکھنے۔" یہ ننھی سی بچی میرے مکان کے عقب میں رہتی ہے۔ اسی شب کو تقریباً ۱۱ بجے دل کا شدید دَورہ پڑا اور بیس منٹ کے مختصر وقفے میں اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔"

نیّر صاحب نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری ——— ان کی زندگی ایک سیدھی لکیر تھی ——— ایک صراطِ مستقیم ——— ان کی عمر کو ہم بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے خانوں میں نہیں رکھ سکتے۔ اس لیے کہ ان کی زندگی میں کبھی کوئی موڑ نہیں آیا۔ بچپن سے بڑھاپے تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بچّوں کی طرح ہمیشہ معصوم رہے۔ انھوں نے اپنی فطرت کو کبھی آلودہ نہیں کیا۔ علم کا شوق بچپن سے تھا، بڑھاپے تک رہا۔ ایسے آدمی روز روز پیدا نہیں ہوتے جو اپنے بچپن کو اس خوبصورتی کے ساتھ بچا کر لے جائیں کہ اس کے صاف ستھرے شیشے پر کوئی بال نہ آئے ——— نیّر صاحب نے بڑے سچے دل سے یہ بات کہی ہے:

www.taemeernews.com

"میرا جی بس یہ چاہتا ہے کہ ہر بچّہ بچپن ہی سے محنت کی عادت ڈالے۔ وہ دشواریوں میں ہمّت نہ ہارے تاکہ وہ اپنی، اپنے کنبے، اپنی قوم اور سب انسانوں کی خدمت بہتر سے بہتر انداز میں کر سکے۔"

نیّر صاحب خود اس سیدھے راستے پر چلتے رہے ——— انھوں نے محنت کی، دشواریوں کا مقابلہ کیا، کبھی ہمّت نہیں ہاری، انھوں نے ایک اچھے خاندان کی بنیاد ڈالی جو آنے والے برسوں تک ان کے نام سے پہچانا جائے گا ——— انھوں نے قوم کی خدمت کی ——— اور عام انسان کی بھلائی کے لیے اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دیا۔ اپنی زندگی کا ایک ایک ——— یہاں تک کہ آخری لمحہ بھی ——— ایسے انسان اس معاشرے میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ میں جب نیّر صاحب کو یاد کرتا ہوں تو مجھے ہمیشہ ٹیگور کا یہ شعر یاد آتا ہے:

جب کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے تو میں سوچتا ہوں
کہ خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے

لیکن اب تو نیر صاحب بھی اس دُنیا میں موجود نہیں ———!!!

ختم شد

www.taemeernews.com

شفیع الدین نیّر

مطالعہ

مکتبہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دلّی ۲۵

www.taemeernews.com

بچوں کا پرانا ساتھی

ماہنامہ

پیام تعلیم

فوٹو آفسٹ کے ذریعے چھپنے لگا ہے۔ اب اس میں رنگ برنگی تصویریں بھی ہیں اور کارٹون بھی سبق آموز کہانیاں بھی ہیں اور مزیدار نظمیں بھی۔ ان کے علاوہ سیر و سیاحت، جنرل سائنس، تاریخ، جغرافیہ اور شہریت کے آداب پر دلچسپ انداز میں بہترین مواد بھی ہوگا۔

قیمت سالانہ: 16/- روپے * فی پرچہ :- 1/70

غیر ممالک کے لیے۔ سالانہ قیمت :- 75/- روپے

ماہنامہ : پیام تعلیم ۔ جامعہ نگر ۔ نئی دہلی ۲۵۔۱۱۰۰